پتّیوں پر چھڑکاؤ

(طنزیہ مزاحیہ مضامین)

کتاب بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

نام کتاب : ——— پتیوں پہ چھڑکاؤ

مصنّف : ——— احمد جمال پاشا

سن اشاعت : ——— ۱۹۸۶ء

مطبع : ——— وارڈ آفسیٹ پریس، بھنور پوکھر، پٹنہ ۴

ناشر : ——— پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،
کوٹھی "نشاط افزا" سیوان ۸۴۱۲۲۶

تعداد : ——— ایک ہزار

قیمت : ——— تیس روپے

ملنے کے پتے

۱۔ پاشا اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ "نشاط افزا" سیوان، بہار
۲۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی۔ 100025
۳۔ نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ۔
۴۔ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ، لکھنؤ۔
۵۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴
۶۔ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴
۷۔ پرویز بک ہاؤس، سبزی باغ، پٹنہ ۴

فہرست مضامین

فہرست مضامین | صفحات

- انتساب ـــــــــ ۵
- تقریب : پروفیسر وہاب اشرفی ـــــــ ۷
- جڑوں کی تلاش میں ـــــــ ۱۵

مضامین :

۱۔ تماشائے ادب ـــــــ ۲۱
۲۔ شرافت کی تلاش میں ـــــــ ۲۷
۳۔ جنت سے واپسی ـــــــ ۳۴
۴۔ کتاب کی جلد ـــــــ ۳۹
۵۔ محبوب کی فریاد ـــــــ ۴۹
۶۔ گلی ڈنڈے پر سمینار ـــــــ ۶۷
۷۔ ادکیات ـــــــ ۷۸
۸۔ مرزا آمد بیگ ـــــــ ۸۵

۹۔ استاد حیرت ———— ۹۰
۱۰۔ امتحان میں نقل کا فن ———— ۹۷
۱۱۔ لالہ توندو مل ———— ۱۰۹
۱۲۔ سب سے بڑی ذات بذات ———— ۱۱۶
۱۳۔ جائیں تو جائیں کہاں ———— ۱۲۲
۱۴۔ گدھے کی شان میں ایک قصیدہ ———— ۱۲۸
۱۵۔ جب میرا پہلا مضمون چھپا ———— ۱۳۴
۱۶۔ ذکر اس پری وش کا ———— ۱۳۹
۱۷۔ چمچہ کانفرنس ———— ۱۴۵
۱۸۔ نوکر کا چکر ———— ۱۵۱
۱۹۔ غالب اینڈ کمپنی ———— ۱۶۱
۲۰۔ اقبال کی تلاش میں ———— ۱۶۸
• طرزِ پاشا : —— پروفیسر عبدالمغنی ———— ۱۷۳

فکرِ تونسوی

کے

نام

حرف اوّل

پروفیسر وہاب اشرفی

تقریب

O sacred weapon! Left for Truth's defence,
Sole dread of Folly, Vice, and Insolence!
To all but Heaven's- directed hands deny'd,
The Muse may give thee, but the God must guide.
Rev'rent I touch thee!

احمد جمال پاشا کی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات پر پوپ کے یہ اشعار صادق آتے ہیں، آخر شعر و ادب میں طنز و مزاح کی کارگذاری کیا ہے؟ اور ان کا منصب کن امور سے متعین ہوتا ہے، جواب، پوپ کی سطروں میں موجود ہے، ٹھیک ہے کہ نثر نگار کا Muse سے کوئی علاقہ نہیں لیکن خدا تو اس کے یہاں بھی موجود ہے جو زندگی کی بے شمار ناہمواریوں کی شکایت کا اسے موقعہ فراہم کرتا ہے، محض شکایت کا نہیں بلکہ ان کے خلاف احتجاج کا بھی، یہ احتجاج ہنستے ہوئے انداز میں ہو اور رُلا نے کی سبیل پیدا کر دے تو

بڑا مزاحیہ اور طنزیہ ادب، پیدا ہوتا ہے۔

احمد جمال پاشا احتجاجی مزاحیہ نگار ہیں، لیکن ان کا احتجاج بے جا نہیں ہے۔ اشارے اور کنائے کے ساتھ ساتھ واقعات و سانحات کے شیریں کیپسول میں چھپا ہوتا ہے، اور آئی۔ ان جیک کی تعریف پر منطبق ہے کہ

Satire is born of the instinct to protest;

it is a protest which becomes art.

احمد جمال پاشا بھی اپنے احتجاج کو فن کی سطح پر لے جاتے ہیں، ورنہ وہ محض احتجاجی ادیب ہوتے فنکار نہ بن پاتے۔

سماج کے اندر پھیلی ہوئی پراگندگی کا احساس کسے نہیں ہے، کون برائی کو برائی باور نہیں کرتا، عیب تو عیب ہیں، استحصال کسے پسند ہے؟ لیکن ہم اپنی ذات کے خول میں گم ہیں، ہمارے پاس آنکھیں ہیں لیکن بے نور، ہم معاشرے کی تمام تر گندگیوں کے ساتھ جی لینے کے عادی ہو چکے ہیں، ادیب خصوصاً طنز و مزاح سے وابستہ ادیب ایسا نہیں کر سکتا، آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اندھیرے میں لالٹین لئے ایسے معاشرے میں گھومتا رہتا ہے، اس پر بھی آپ کی آنکھیں بند ہی رہیں تو فنکار کیا کر سکتا ہے۔ ڈینو کا تصور مستعار لوں تو کہہ سکتا ہوں کہ احمد جمال پاشا اپنے مزاح میں reformation کا پہلو رکھتے ہیں، ڈینو کا خیال تھا کہ طنزیہ تحریریں اصلاحی کارکردگی کی حامل ہوتی ہیں، کیا ایسا نہیں ہے کہ احمد جمال پاشا کی تحریروں میں یہ جذبہ یعنی اصلاح کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔

Swift نے طنز کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں، وہ لکھتا ہے:

'It is a sort of glass where in beholders

do generally discover every body's face but their own, which is the chief reason for that kind of reception it meet in the world, and that so very few are offended with it.'

احمد جمال پاشا جو چہرے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں، حمق کی جس کیفیت سے ہمیں آگاہ کرنا چاہتے ہیں، ہم ان سے آگاہ اور آشنا ہو جاتے ہیں مگر ان کے اس فنکارانہ رویّہ سے کسی کا دل بھی نہیں دکھتا، پاشا اور کئی دوسرے طنز و ظرافت سے وابستہ ادیبوں میں حدِّ فاصل بھی یہی ہے، پاشا چاہے مسخ شدہ چہرے دکھائیں یا کسی واقعے کی سفا کانہ صورت سامنے لائیں قاری ہنستے ہنستے ہی سب کچھ دیکھ لیتا ہے، اب وہ ایسے معاملات سے تب بھی اپنے آپ کو الگ رکھے اور 'اصلاح' پر کمر بستہ نہ ہو تو اس میں خالق کا کیا قصور۔۔۔

Ronald Konx نے طنز نگار کو ایسے بچے سے مماثل قرار دیا ہے جسکے ہاتھوں میں پانی بھری پستول ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس کا نشانہ اگر ٹھیک بھی بیٹھے تو زخمی کا کیا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ہاتھوں میں جو پستول ہے وہ انتہائی گرم پانی سے بھری ہوتی ہے اور جس پر نشانہ لگایا جاتا ہے وہ یقینی جل جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کے زخمی چہرے تو ہم اپنی ننگی آنکھوں سے نہیں دیکھ پاتے لیکن جسے مجروح ہونا تھا وہ مجروح ہو چکا ہے، پاشا کی Delicacy کا بھی یہی حال ہے، وہ ہنستے ہنستے زخمی کرتے ہیں، زخمی ہونے والا بھی ہنستا ہے لیکن اس کا جسم مجروح ہو چکا ہوتا ہے، ایسے ہی طریقۂ کار کو Art lies in concealing art کہتے ہیں۔ گویا احمد جمال پاشا

ہماری 'مہذب سوسائٹی' کے جری نقاد ہیں، سماج کی آلودگیوں سے نبرد آزما ہیں، زندگی کے احمقانہ تصورات کے خلاف صف آرا ہیں، معاشرے سے اس کے تمام عیوب دھو ڈالنا چاہتے ہیں، گوڈن کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ

He is a man who takes it upon himself to correct, censure and ridicule the follies and vices of society and thus to learning contempt and derision upon abberrations from a desirable and civilized norm.

یہ ایک طرح کی یوٹوپیا کی تعمیر کا خواب بھی ہو سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ احمد جمال پاشا ایسے خواب دیکھتے ہیں، جنکی تعبیر ان کی تلخ و شیریں تخلیقات ہیں جن میں ہمارا سماج ننگا ہے، ایسے ننگے سماج سے ہم ہمدردی نہیں کر سکتے، اگر ازالہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ پاشا کی غایت بھی یہی ہے اور ان کی فکر کا محور بھی یہی، ورنہ محض ہنسنے ہنسانے کا کام تو چٹکلوں سے بھی انجام پا جاتا ہے۔ لیکن احمد جمال پاشا کی فکر کی کلید ہنسنے ہنسانے میں نہیں بلکہ معاشرے کے کمزور پہلوؤں کی نشان دہی میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں احمد جمال پاشا کی نگارشات میں Humour تلاش نہیں کرتا بلکہ Ironical صورت واقعہ کی تفصیل میں اترنا چاہتا ہوں، سچ تو یہ ہے کہ احمد جمال پاشا کا علاقہ ہیوم سے زیادہ wit سے ہے، اور یہ ایک بڑی تخلیقی صلاحیت ہے جسکے بغیر کوئی تخلیق Ironical ہیئت اختیار نہیں کر پاتی۔ سترہویں صدی کے انگریزی شعرا مثلاً ڈن، ہربرٹ، کراشا وغیرہ کو وٹ کا شہنشاہ کہا جاتا ہے، لیکن وہاں وٹ دوسرے معنی میں بھی ہے،

پھر بھی ان شعرا کے یہاں بھی Ironical Sitanation اسی تخلیقی صلاحیت کے باعث پیدا ہوتی ہیں، اگر کوئی شخص پاشا کے یہاں Paradoxes کا متلاشی ہو تو اسے بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوگی لیکن اگر اس کی مہم یہ ہو کہ ان کی تخلیقات میں رٹ اور آئرنی کی جستجو کرے تو اسے سرتاسر کامیابی نصیب ہوگی۔

معیاری طنزیہ و مزاحیہ تحریریں سنجیدگی سے آراستہ ہوتی ہیں، ان میں ٹھٹھول تقریباً نہیں ہوتا لیکن اردو کے کئی مزاح نگار مسخرے بن جاتے ہیں یہی سبب ہے کہ ان کی نگارشات کا وزن اور وقار سرے سے معدوم ہو جاتا ہے" پاشا اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں، ان کے مزاح میں کژدم جرارہ چھپا ہوتا ہے۔ اب ڈنک کے اثر کو کوئی سہن کرے تو اور بات ہوئی اسے بہر طور تلملانا چاہئے" پاشا کی ہنسی زہر میں بجھا ہوا تیر ہے جو ہمیشہ نشانے پر بیٹھتا ہے۔

احمد جمال پاشا پلان، ڈیزائن، یا پیٹرن کے بغیر کوئی طنزیہ یا مزاحیہ مضمون نہیں لکھتے لہٰذا ان کی طنزیہ اور مزاحیہ تحریریں، خاکے، چربے، فیچر سب کے سب Ironical Pre conceived ہیئت رکھتے ہیں۔ دی ہیئت جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں، گویا ان کے مضامین میں انشائیائی رنگ نہیں ہے بلکہ بہترین باجراسازی ہے، ان کی تحریروں کا یہ وصف ان کے معاصرین سے ان کو الگ بھی کرتا ہے اور ایک اشتیاق Suspence یا curiosity بھی بخشتا ہے۔ اچھی باجراسازی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، یہ عناصر پڑھنے والوں کو اختتام تک کی منزل تک لے جاتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ پاشا کے مضامین ایک بار گرفت میں لے لیتے ہیں تو پھر چھوڑتے نہیں جب تک کہ آخری منزل نہ آجائے اور قاری کی مکمل کتھارسس نہ ہو جائے۔

انگریزی کی ایک ادبی اصطلاح ہے Tapinosis ' اس کے ذریعہ بڑی بلاغت سے مبالغے کے انداز میں بڑی چیزوں کو چھوٹی بنا کر پیش کرایا جاتا ' سودا کے یہاں گھوڑے کی ہجو اس کی ایک عمدہ مثال ہے ' پوپ کے یہاں Timon's villa کی تصویر دیکھئے :

Greatness with Timon, dwells in such a drought,
As brings all Brobdigang before you thought.
To compass this, his building is a Town,
His Pond an ocean, his Parterre a Down
Who but must laugh, the Master when he sees
A puny insect, shiv'ring at a breeze:
Lo, what huge heap's of littleness around!

(Epistle IV)

نثر میں ایسے تاثر کے حصول کے لئے احمد جمال پاشا بھی Tapinosis کی صفت کا استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں عظیم اشیا جس طرح حقیر بنا کر پیش کر دی جاتی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہوتی ہیں ۔ میرے خیال میں اس باب میں احمد جمال پاشا کا کوئی دوسرا حریف نہیں ۔ ہاں طنز نگار شعرا کے یہاں ایسی صورت کمیاب نہیں ہے ' لیکن جب میں احمد جمال پاشا کے معاصرین کے حریف کی باتیں کرتا ہوں تو صرف ہندوستانی ادبا میری نگاہ میں ہیں ۔ پاکستان کے مزاحیہ اور طنزیہ نگاروں نے ادھر اس صنف پر خوب خوب توجہ دی ہے ' ' زرگزشت ' تو ٹیپوسس کی مثالوں سے بھری پڑی ہے '

اس طرف مجتبیٰ حسین نے ایسے عمل سے اپنی تحریروں کی لے تیز کرنی شروع کر دی ہے لیکن احمد جمال پاشا کے یہاں یہ عمل Interent ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اس صفت سے شعوری طور پر واقف نہ ہوں لیکن ان کے محتویات کا جائزہ لیجئے تو اس کی کارکردگی کا اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ احمد جمال پاشا اپنے شکار کو Lampoon بنا ڈالتے ہیں، یعنی ان کے یہاں rough credility نہیں ہے، دراصل ان کا مقصد کسی چہرے کو مسخ کرنا نہیں ہوتا اس فن میں تو Dryden ماہر تھا، شیڈول کو اوگ کی شکل میں دیکھنا ہو تو Absolam and Achitophel کا مطالعہ کیجئے، لیمپوننگ کی ساری تکنیک سمجھ میں آجائے گی، پاشا چہرے کی دھول صاف کرتے ہیں اسے داغدار نہیں بناتے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ احمد جمال پاشا کے یہاں کسی شئے کے لئے 'شدید نفرت'، ناپسندیدگی یا بوریت کے اظہار کا جذبہ نہیں پایا جاتا لیکن اس حد تک نہیں کہ ایسے اظہار کو Invective کہہ دیا جائے۔ دراصل پاشا اپنے ردعمل پر ایک دلکش نقاب چڑھا ڈالتے ہیں، اس لئے طنز کا زہر تلخ ہونے کے باوجود Disgust کا پہلو نہیں پیدا کرتا۔

اوپر کے مباحث "پتیوں پر چھڑکاؤ" پر بھی صادق آتے ہیں اور پاشا کے تمام طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر بھی، اس مجموعے کے ۲۰ مضامین محض دل بہلانے کے لئے نہیں ہیں، ان میں وہ سارے امور ہیں جنکی تفصیل آچکی ہے اور جسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ احمد جمال پاشا طنز و مزاح کے منصب اور ان کی کارکردگی سے بخوبی واقف ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے تمام مضامین کی تحلیل کی جائے، تجزیے سے گذارا جائے، لیکن یہاں اس کا موقعہ نہیں ہے، امتیازی طور پر جن نکات کی نشاندہی ہو سکتی تھی

وہ احاطۂ تحریر میں آچکے ہیں، میری گذارش ہوگی کہ اس پس منظر میں قاری احمد جمال پاشا کے مضامین کا مطالعہ کریں تو ان پر ایک نیا عالم خیال روشن ہوگا ویسے اردو ادب میں طویل طنزیہ و مزاحیہ تخلیق کی اب بھی ضرورت باقی ہے، ہمیں آج بھی اردو میں کسی Swift، کسی Voltaire، کسی Butler، کسی George Orwell وغیرہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، "گدھے کی سرگذشت" کی روایت کی توسیع ہونی چاہئے، یہ کام احمد جمال پاشا کرسکتے ہیں، مجتبیٰ حسین انجام دے سکتے ہیں، یہ کام پاکستان کے طنز نگار شروع بھی کرچکے ہیں۔ نام گنوانے کی ضرورت نہیں:

بیا کہ رایت منصور پادشاہ رسید
نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید

نوّے ۹۰ سال تک ۔ ہم نے اپنی قومی جڑوں کی سینچائی کی تو ترش ترشا کر ایک آزاد قوم کی شکل میں دُنیا کے نقشے پر طلوع ہوئے ۔ مگر آزادی کے سُورج کی روشنی صرف میزبانوں کے باورچی خانوں پر پڑی ۔ جمہوریت کا مَطلع ابر آلود ہی رہا ۔ من کی دُنیا تن کی دُنیا میں بدلی تو ہم نے بجائے دماغ کے معدے سے سوچنا شروع کر دیا ۔ اور رفتہ رفتہ قومی ضعفِ معدہ میں مبتلا ہو گئے ۔ ہمارا قومی کردار اگر کوئی تھا بھی تو اَن گنت مراد آباد اور جمشید پوروں نے چیچک زدہ کر دیا ۔

خُدا بھلا کرے اُن برساتی مینڈھکوں کا جو خیر سے خدائی فوجدار بلکہ خدائی خوار لیڈرانِ وقت کا جواز روئے پیشہ اب پشتینی لیڈر کہلانے کی چمک دمک میں قومی درخت کی پتیوں پر چھڑکاؤ میں مصروف ہیں ۔ زمانہ عمل نہیں بیانات کا ہے ۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے ۔ لب پہ آسکتا نہیں ۔ ناگفتنی صورتِ حال یہ ہے کہ ٹک ٹک دیدم دَم نہ کشیدم ۔

سماجی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا یہ دورِ وحشت طنز و مزاح کے پنپنے کے لئے زرّیں موقع ہے ۔ اگر طنز و مزاح کے فن سے فنکار واقف ہے ۔ اور عصری آگہی سے مرصّع

تو اس فن کو بلندیوں سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ جس کے لئے آگ کے دریا کو تیر کر جانا ضروری سمجھا گیا ہے۔

"بتیوں پر پھڑ کاؤ" میرے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے جو پیشِ خدمت ہے۔ اِن مضامینِ نو بہ نو میں پیشِ منظر کی جھلکیوں کی پرچھائیاں اسیر کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ وسیع اور بیکراں زندگی کے اَن گنت شفق رنگ میں شائد آپ کو تماشا اور تماشائی دونوں نظر آجائیں۔

قومی زندگی کے اس پُر آشوب دور میں بارود کے دھماکے کے انتظار میں اُترے ہوئے چہروں پر بشاشت کی کوئی لہر دوڑ جائے، فکر و مسکراہٹ کا کوئی دریچہ وا ہو جائے تو میں اِسے انعام سمجھوں گا۔

یہ مضامین کیسے ہیں؟ اگر آپ خود طنز یا مزاح نگار ہیں یا نقّاد ہیں تو شائد زیادہ صحیح فیصلہ کر سکیں۔ غالباً سب سے صحیح رائے تو عام قاری کی ہوا کرتی ہے۔ یوں وقت سب سے بڑا منصف ہے، جو ہر تعصب، جانبداری، تنگ نظری، علاقائیت، طبقاتی عصبیت اور ہر قسم کی ملاوٹ کی چربی چھانٹ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی پیش کر دیتا ہے۔

خاکسار گوشہ نشیں قسم کا انسان ہے۔ گوشے میں ادب کے مجھے آرام بہت ہے۔ اڈیٹروں سے دوستی، معاصرین کو چرکے، نقّادوں کی پذیرائی، مرغ اور میز پر ادبی فیصلے اور ہنگامِ ادب سے بندہ کوسوں دُور بھاگتا ہے۔ اور صحبتِ ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ادب اور عاقبت سے ڈرتا اور صرف پڑھتا لکھتا ہے۔ پڑھنا یکسوئی کا عمل ہے جو سَوت برداشت نہیں کر سکتا۔ لکھنا تو ایسا ہے جیسے سُنار زیور گڑھتا ہے۔ وہ تخلیقی عمل کیا جو

تخلیق کے کرب سے نہ گذرے اور پھر قطع و برید، تراش و خراش کا عمل۔ پھر بھی کون گذرا ہے آفاق کی منزل سے سلامت۔ یہ تو بس کارگہ شیشہ گری ہے۔

میرے لئے تو خط کا جواب دینا بھی ایک امتحان سے کم نہیں۔ مور تو اپنے ہی پاؤں دیکھ کر شرما جاتا ہے۔ تقریباً ۱۹۵۰ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ۱۹۸۶ء آ لگا۔ بچپن، جوانی اور جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی۔ تجربے اور سمجھ نے صرف اتنا بتایا کہ اچھا لکھنے سے بہتر کوئی تعارف نہیں۔ شناخت کے سوا باقی سب کچھ کلچر تو ہے پر ادب نہیں۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ "ادیب کا بڑھاپا اور ادب پر جوانی ساتھ ساتھ آتی ہے۔" آتی ہے تو آئے پر خدا کرے بچپنا نہ آئے۔

بہار کی سرزمین ظرافت کے لئے کس قدر زرخیز ہے اس کا کچھ اندازہ شائد آپ کو ان مضامین کی شانِ نزول سے ہو سکے۔ کہ آتے ہیں مضامین غیب سے۔

اگر آپ اس کتاب کو پڑھنے کی سعادت سے سرفراز ہو چکے ہیں تو شکریہ۔ اگر آپ اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں تو گرہ میں باندھ لوں گا کہ ___ داشتہ آید بکار۔ بلا کسی خوش فہمی کے اب میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ جو مزاجِ یار میں آئے۔

احمد جمال پاشا

12 . 1 - 85

کوٹھی "نشاط افزا"
سیوان 841226
بہار

مضامین

تماشائے ادب

تماشا دکھانا فنکاری، مہارت اور جسارت کے بلا ممکن نہیں۔ اسی لئے ایسے فنکاروں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے جتنی کہ مداریوں کی۔ مداری کا ذکر خیر اس لئے ناگزیر ہے کہ وہ بھیڑ اکٹھی کرنے، پبلک جمع کرنے، راہ گیروں کو خوش کرنے کے لئے نہ دعوت نامے جاری کرتے ہیں نہ گیس بتی اور لاؤڈ اسپیکر کا اہتمام کرتے ہیں، نہ اہل تماشا کے سفر خرچ اور تفریحی ٹیکس کا جھول پالتے ہیں۔ بس بین بجائی ایک آدھ لیکچر جھاڑا۔ تماشائیوں میں سے کسی کو جمہورے بنایا خراج وصول کیا، دل شاد ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔

یوں تو زندگی خود ایک نہ ختم ہونے والا مسلسل تماشا ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے جس میں ادب کم اور تماشا زیادہ نظر آتا ہے۔ پھر بھی میں ادب کو تماشا نہیں سمجھتا۔ اس کے باوجود مجھے اس کے تماشے دیکھنے اور سمجھنے پڑتے ہیں۔ گزشتہ تجربات، مشاہدات اور صدمات کی بنیاد پر ببانگ دہل دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ؏

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میں اسے اہل نظر کی طرح اس وضع احتیاط سے دیکھتا ہوں کہ تک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔

ادب میں تماشا بعد میں اور بھیڑ چال شاعری پہلے وارد ہوتی ہے جسے عام طور پر مشاعرے برپا کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ جو اہل ستم ان کے محرک، داعی وغیرہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ خود کسی تماشے سے کم نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں وہ بڑی تیاریاں کرتے ہیں۔ جس مسخرے کو بھی اپنی شاعرانہ عظمت اور مالی حیثیت ذرا دبتی نظر آتی ہے۔ اسے ابھارنے، بڑھانے اور تعلقات عامہ استوار کرنے کے لئے ایک اور مشاعرہ برپا کر دیتا ہے۔ از قسم فلمی مشاعرہ، کرکیٹ یا فٹ بال مشاعرہ، قوالی مشاعرہ، مسخرا مشاعرہ خواتین مشاعرہ۔ وصیتی و تعزیتی مشاعرہ وغیرہ وغیرہ۔

انتظامی اور مالی پل صراط سے سلامتی کے ساتھ گزرنے کے بعد وہ لوگ بیک سے درست ہو کر صدر مشاعرہ یا اناؤنسر سے چپک کر ریڈیو پروگراموں میں یا کٹھ پتلی کے تماشے کی طرح مشاعرے کو اس کے فطری انجام تک پہونچاتا ہے۔ جس کے لئے وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک معزز ہستی از قسم لوٹا بھائی گوشہ والا کی خدمت میں مسند صدارت پیش کرتا ہے۔ وہ صدر اور اناؤنسر میں اس لئے فاصلہ رکھتا ہے تاکہ صدر محترم کے خراٹے نشر ہو کر صدر اور شاعر میں تصادم کا باعث نہ بن جائیں۔ صدر کے سر پر سے پورا مشاعرہ گذر جاتا ہے۔ مگر وہ آہ کرتا ہے نہ واہ۔ شاعری کے میدان میں اس کی حیثیت خالی پٹاری کے مداریوں کی ہوتی ہے۔ اس کے داہنے اور بائیں، پان کھاتے اور سگریٹ پیتے اور چہرے پر عذاب قبر کے آثار پیدا کرنے کے لئے دو عدد اعلا ریٹائرڈ حکام بہ حیثیت مہمان خصوصی بٹھا دئے جاتے ہیں تاکہ ان کے رعب و داب سے مشاعرہ منڈی میں نہ تبدیل ہونے پائے۔ ہر انڈ دیاک شاعر اپنی آزمودہ غزل سے چھینٹیں اڑا دیتا ہے۔ اساتذہ اور اناڑی اپنے بہترین کلام اور بدترین گلے سے مشاعرہ کو ہڑبونگ میں تبدیل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پورا مشاعرہ سمٹ کر صاحب مشاعرہ کی

شخصیت میں جذب ہو جاتا ہے۔ شعرائے کرام داد دینے کے لئے منتشر ہو جاتے ہیں۔ تماشائی تحلیل ہو جاتے ہیں۔ کامیاب شاعر، صاحبِ مشاعرہ کے ساتھ غرق مے ناب ہو جاتے ہیں۔ تماشا ختم پیسہ ہضم۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

ادبی کانفرنسیں کسی تماشے سے کم نہیں ہوتیں۔ ادیبوں میں کچھ ایسے بھی مفکر ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو رفتارِ ادب، ادیبوں کی یوم پیدائش، وفات، جشن، جبلی، جمہور اور جمود کا براہ راست ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں بڑے بکھاڑ اور معذور سمجھتے ہیں۔ ادیبوں اور ادب نوازوں کو خیر سگالی تبادلے کے لئے انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ دعوت نامہ ایک تہذیبی اور معاشی عمل ہے جس میں من تُرا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ اور بل آف ایکسچینج کے اصول پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کانفرنس کے تمام اجلاسوں کا پروگرام بڑی احتیاط سے کیا جاتا ہے تاکہ دور دراز سے آنے والوں یا شامت کے ماروں پر میزبانوں کی ادبی حیثیت، اور عظمت مسلّم ہو سکے۔ مجلس الصدور میں میزبان ہر اچھے موقع پر میزبان بڑے کے لئے مہمان۔ مہمان یا مندوب کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لئے میزبان بزرگانہ جھڑکیوں اور ادیبانہ پینتروں سے کام لیتا ہے۔

گذشتہ ہفتہ ایک بین اقوامی کانفرنس میں بہ نفس نفیس مجھے شرکت کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ جس کی خبروں اور تصاویر سے بڑے بڑے اخبارات تک کے پیٹ پھول گئے تھے۔ اس کانفرنس میں بیس لاؤڈ اسپیکر اور مجھے ملا کر کل چھ نفوس تھے جن میں پانچ اللہ کے بندے کانفرنس کے کارکنان قضا و قدر تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح کرنے ایک ممتاز فلمی ستارہ تشریف لا رہا تھا۔ اس کی تشریف کا ٹوکرا جب کانفرنس ہال کے پھاٹک سے دوچار قدم رہ گیا اور دوچار ہاتھ لب بام والا معاملہ ہوا تو قسمت کی کمند ٹوٹ گئی۔

استقبال کرنے والے ہزاروں شرکار کے ہجوم سے اس کی حرکت قلب بند ہونے یا حبس دَم کا عمل شروع ہوگیا۔ پرستاروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ صدر اسپتال پہونچا دیا۔ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ فلمی ستارے کے جھرمٹ میں پوری کانفرنس اسپتال کو جام کئے ہوئے تھی۔ ادھر کانفرنس ہال میں اسپتال والا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مایوسی کے عالم میں منتظمین نے یہ تجویز رکھی کہ کانفرنس اسپتال میں شروع کردی جائے' جسے اسپتال والوں نے بصد شکریہ مسترد کردیا۔ ادبی کانفرنس دراصل ایک جُوا ہوتا ہے۔ جس میں بازی ہاری بھی جاسکتی ہے۔ جیتی بھی اور پیسہ پھینک کر تماشا دیکھا جاتا ہے۔

سیمینار اور سمپوزیم ادب کے اکھاڑے میں ہلکی پھلکی ادبی مشقوں کے لئے برپا ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ذہنی جسمانی ورزش کی تکمیل اس سے فی الفور ہوجاتی ہے۔ اگر سیمینار اور سمپوزیم نہ ہوں تو غالبؔ اور اقبالؔ کی چھاؤں تلے بیٹھ کر یہ کیسے طے ہوسکے کہ فلاں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلانے کے لئے کس جگہ کس کو بلوایا جائے جو داؤں میں کاٹ نہ ہوسکے۔ کس کی لیکچرر شپ عارضی سے مستقل کیسے ہو؟ کسی کی ریڈر شپ کیسے ہڑپ کرلی جائے۔ پروفیسر شپ کے لئے کون سی تگڑم کی جائے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ہر کانفرنس میں مذہبی، علاقائی، خاندانی اور پارٹیائی بنیادوں پر صدہا مرحلۂ شوق طے ہوجاتے ہیں۔ سامنے دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔ چبا چبا کر مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ بڑھ چڑھ کر آستین چڑھا کر فکر و نظر کے درِ وا کئے جاتے ہیں۔ مگر اصل سیمینار اور سمپوزیم رات کو مہمان و میزبان کے کمروں میں ہوتے ہیں۔ بقول شخصے سیمینار اور سمپوزیم کا اصل سٹّہ رات کی تنہائی میں ہوتا ہے اور بڑے بڑے سودے اشاروں اشاروں میں ہوجاتے ہیں۔

ادبی تماشوں میں ٹیپ کا بند ادبی تقریب یا شعری تقریب' ادبی ہنگامی نشستوں کی

شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جس کے لئے ڈھونڈ ڈھانڈ کر عذرِ ہنگامہ یا وجہِ بلوہ تلاش کی جاتی ہے۔ چُن چُن کر برسرِ اقتدار، اور صاحبِ کرسی عزت مآبوں کو بر آمد کیا جاتا ہے کیونکہ مجمع اہلِ زبان کا ہوتا ہے۔ اس لئے بے زبان کرسیوں پر بیٹھا دیئے جاتے ہیں۔ گوشت کے بورے سجا دیئے جاتے ہیں۔ احتیاطاً اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر پڑھا لکھا آدمی آئے تو اس کی رائے نہ خراب ہو جائے۔ پڑھائی لکھائی کا بھرم نہ کُھل جائے۔ اگر اس نشست یا تقریب کا تعلق اُردوئے مرحوم سے ہے تو صدارت کرنے والے مہمان یا مدعوئین خصوصی یا وی آئی پی حضرات راجستھانی جانتے ہوں گے، گجراتی کے ماہر ہوں گے، اُڑیا کے عالم ہوں گے، انگریزی میں فاضل ہوں یا پشتو میں فاضلِ اجل ہوں، بلوچی، بنگلہ یا سندھی ادب کے گل سرسبد ہوں مگر ٹوٹی پھوٹی اردو پر بھی قادر نہ ہوں گے۔ عموماً ہر وی آئی پی جب یہ فرماتا ہے کہ:

"میں اُردو بھاسا کا جانکار نہیں .... اقبال صاحب سے مسٹر بھاسکر نے پچھلے سپتمبر میں میل ملاپ کرایا تھا۔ ان کی سائری تو بڑے اونچا پایا کی نکل گئی ہے ...... گالب صاحب کی تعبیر آپ نے تو بڑھیا لگا دی۔ ایسا کلاسیکل آدمی، اس کو تو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ زیاستی پیسہ دیتے مگر اسے جرور بلواتے۔ بڑی خراب بات ہے۔ آرٹسٹ کو کھیال رکھو۔ ہاتھوں ہاتھ لو۔ یورپ میں سائر، ساہتیہ کار کو ہی لوگ باگ ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ سکسپیئر کا کھیال رکھا گیا تھا کیا ٹاپ کا نکل گیا ...... میں اُردو نہیں جانتا مگر سائیں! فیض صاجب آپ کے اچھے سائر گذرے ہیں۔ آج آپ ان کا یہاں ڈے منا رہے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کو اُنی کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتے رہنا ہے ......"

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا پر زبردست تالیاں بجتی ہیں۔ اہل جلسہ میں غالب اور اقبال سے ملاقات کا اشتیاق اور فیض کے ادبی عرس کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ گردوں عمر کی گھڑی گھمانے اور غافل کو عمر کے بڑھنے اور بڑائی کا پہاڑ بنانے سے نہ کبھی فرصت ملی ہے اور نہ ملے گی۔ جب بربادی وقت کی کوفت لذتِ فکر و نظر کے بجائے ہاتھ آئے تو خود بخود طبیعت' انار کی کی جانب مائل ہونے لگتی ہے۔ لیکن دہشت پسندی کے خیال سے دحشت سی ہونے لگتی ہے۔ میں اپنی لائبریری میں گوشہ گیر ہو جاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری دنیا کتنی تنگ و تاریک تھی جس میں بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھا چاول پر قل ہو اللہ لکھ رہا تھا۔ مگر میری لائبریری ایک وسیع اور بے کراں کائنات ہے۔ علم اور عقل سے روشن ہر کتاب مان تین سے وزیر آغا تک سر دانٹیز سے کنہیا لال کپور تک بے شمار پیر روشن ضمیر۔ جن کی ہر کتاب دانش کا ایک نیا باب۔ تحسین' بصیرت' اور مسرت کا جہانِ تازہ ہے۔ دنیا کا ہر موضوع' ہر میدان' علم کی ہر شاخ' ادب' فلسفہ' تہذیب اور فنونِ لطیفہ میں عقل کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

میرا وجود ایک رنگ برنگ خوشنما غبارے کی طرح علمی فضاؤں میں اس وقت تک قندیل کی طرح پرواز کرتا رہتا ہے جب تک کہ تلاشِ ادب میں بھٹکتا ہوا کسی نئے ادبی تماشے کی صفِ سامعین میں نہ پہونچ جاؤں۔ پھر قندیل بجھ جاتی ہے۔ غبارے کی ہوا نکل جاتی ہے کیوں کہ میں غلطی سے باہری تنگ و تاریک دنیا میں بھٹک کر پہونچ گیا تھا۔ میں پھر اپنی دنیا میں واپسی کے لئے جدوجہد شروع کر دیتا ہوں۔

شرافت کی تلاش میں

کسی دور دراز ملک کی ایک خفیہ تجربہ گاہ میں ماہرین مسمریزم دنیا کا اہم ترین تجربہ
کر رہے تھے در اصل قدیم چٹانوں میں ملنے والی بیسویں صدی کی تحریروں سے انکشاف ہوا کہ
اُس زمانے میں ایک شے پائی جاتی تھی جسے "شرافت" کہتے تھے۔ جو مرکب تھی "شر" اور "آفت"
کا جس کے برتنے والے ہر قسم کے "شر" جھیلتے اور "آفتوں" کا سامنا کرتے یہاں تک
کہ ان شرافت کے پتلوں پر آفت کے پرکالے غالب آ گئے۔ انہوں نے شرافت کے سارے
مجسمے دفن کر دیے۔ شرافت کے جو ڈھانچے قدیم چٹانوں میں ملے ان کا تعلق چھٹی اور ساتویں
صدی سے ہے۔ ان کے کیمیاوی تجربے سے حیرت انگیز حقائق سامنے آئے۔ مثلاً ان میں
ساتویں حس بھی ہوتی جسے "انسانیت" کہتے جس کے تحت یہ دوسروں کے دکھ درد اور
آڑے وقتوں تک میں کام آتے۔ بلا کسی صلے کے دوسروں کی پرورش اور امداد کرتے۔ دودھ
پلانے والی اس مخلوق کے پائے جانے والے ڈھانچوں میں سب سے بڑا ڈھانچہ حاتم طائی کا
ہے۔ یہ نسلی، علاقائی، مذہبی تعصب اور عملی زندگی کے دوسرے مقبول عام نظریوں سے عاری
تھے۔ ظاہر و باطن یکساں ہونے کی وجہ سے یہ بے حد سپاٹ، دکھردرے ہوتے اور محض اُبھری

شخصیت کے مالک ہو پاتے۔

اِن ڈھانچوں کے مطالعے سے پہلی شرافت کے جو نمونے ملے وہ انواع واقسام کے ہیں۔ مگر اِن سب کا احاطہ انسانی شرافت کر لیتی۔

پتہ یہ لگانا تھا کہ فی زمانہ دنیا میں شرافت پائے جانے کا کوئی بھی امکان ہے؟ اگر ہے تو کتنے فی صد۔؟

اس پروجکٹ پر کام کے لئے ہم نے امیر، غریب، ڈاکٹر، ناقد، اسمگلر، پولس ایجنسی کرپشن، دانش ور، صحافی، سیاستداں، جرائم پیشہ، سائنسداں، باغی، سیدھے اور ٹیڑھے سماج کے نمائندے منتخب کئے۔

ہمارا طریقہ کار سیدھا سادا تھا۔ نہ تو اعداد وشمار جمع کرنے یا زبانی جمع خرچ کا بندھا ٹکا بھتے بنانے والا انداز تھا۔ نہ فائلیں چلاتے، نہ ٹی وی، ریڈیو، اخباروں اور رسالوں میں دھومیں مچا کر ہوا باندھتے۔

ہمارا ارادہ بہ ظاہر نفسیاتی علاج کا بین الاقوامی مرکز تھا، جس میں پیچیدہ، خود غرض مشینی زندگی کے پیدا کردہ میکانیکی امراض کا شرطیہ علاج ہوتا۔ جس کا تجزیہ کرنا ہوتا اسی کو کسی تقریب کے بہانے بلا کر مہمان رکھتے اور سوتے میں مسمریز کر کے اس کی روح سے سوال جواب ٹیپ کر لیتے۔

سب سے پہلے ہم نے ایک انکل سام ٹائپ کے امریکی سیاستداں کا پوسٹ مارٹم کیا۔ جو وزیر بے تدبیر تھا اور بے خبر سو رہا تھا۔ اس کی روح سے سوال جواب کی تمام کوششیں رائگاں گئیں۔ کیوں کہ وہ اوپر سے وزیر تھا اور اندر سے سی آئی اے ایجنٹ۔ اسی لئے اس کے سرے سے کوئی روح ہی نہ تھی۔ مجبوراً ہم نے بے روح سیاستداں کو جگا کر چلتا کر دیا۔

انتہائی ٹیڑھے انسان کی روح بھیڑ سے بھی زیادہ سیدھی نکلی اس میں شرافت کے کچھ کچھ آثار پائے گئے۔

یہی عمل ایک دانشور پر دُہرایا۔ اُس کی روح تو نکلی پر بے حد مریل۔ اُس نے کہا۔

"بلا شرافت کے تو حال پتلا ہے۔ اگر اسے بھی شامل حال کرلیں تو نہ صرف ٹکے کے تین تین ہو جائیں، بلکہ جان تک کے لالے پڑ جائیں"۔

ایک غیر ملکی جرائم پیشہ کی روح سے پوچھا۔ "تم جرائم پیشہ کیسے ہو گئیں؟" ———

اُس نے کہا "شرافت سے رہنے کا پیاری پولس نے موقع ہی کہاں دیا؟ دن رات وہی مقدموں میں پھانسنا، گواہیاں دلوانا۔ کسی غریب کو دنیا نے شرافت سے رہنے دیا ہے۔؟ یا شریف مانا ہے؟ آپ ہمارے ملک میں جتنے بھی جرائم کرتے رہیں اُتنے ہی سر بلند رہیں گے۔ میں نے جھوٹ سے بھاگنا چاہا۔ مجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ میں نے بد عنوانیوں کے خلاف آواز بلند کرنا چاہی میرا گلا گھونٹ دیا گیا۔ میں نے جرائم کا راستہ اپنایا مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔!"

"تم نے قانون کا سہارا کیوں نہیں لیا۔؟"

"میں شرافت کو بطور لبادہ استعمال کرنے کی قائل نہیں۔ قانون اور حکومتیں آپ کا سب کچھ چھین سکتی ہیں۔ مگر کچھ دے نہیں سکتیں۔" جرائم پیشہ کی روح اپنی گمشدہ شرافت پر آنسو بہانے لگی۔

"اگلی روح ایک انتہائی امیر و کبیر انسان کی تھی۔ اس نے حیرت سے پوچھا "شرافت؟.... شرافت کس چڑیا کا نام ہے؟ ہمارے سمجھانے کے باوجود اُس کے ذہن میں شرافت کا کوئی تصور تک نہ آسکا۔ اس نے دماغ پر انتہائی زور دیتے ہوئے کہا۔" اچھا! اچھا! سمجھ گیا۔ شرافت سے آپ کی مُراد مزدور کا پیسہ، غریب کی عزت، نادار کی عصمت، قانون و انصاف، آرام و آسائش، نام و نمود، عزت و شہرت ہے! ویری گڈ! یہ تمام چیزیں اپنے استعمال کے لئے ہم دو نمبر کے

ہیرے جواہرات، سونے چاندی اور روپے پیسے سے با افراط خریدتے رہتے ہیں۔ اسی کو ہماری شرافت سمجھ لیجئے۔!"

ہم نے سرحد پار اینٹی کرپشن کی روح بیدار کرنے کی کوشش کی۔ وہ بولی۔" مجھے آرام کرنے دیجئے۔ میں قطعی اینٹی نہیں ہوں۔ اگر میں نہ رہوں تو بھائی لوگ کرپشن کو ترس جائیں۔"

ڈاکٹر کی روح بولی۔" ہماری شرافت اصلی مرض کے نقلی علاج میں پوشیدہ ہے۔ دنیا ہمیں دعائیں دیتی ہے۔ ہم اُس کی روح قبض کرتے ہیں۔"

اسمگلر کی روح نے پوچھا۔" شرافت کو کہاں سے اسمگل کیا جا سکتا ہے؟"

سائنسداں کی روح نے کہا۔" ایٹمی جنگ ہو جانے دیجئے اس کے بعد دنیا میں سوائے شرافت کے کچھ باقی نہ رہ جائے گا۔"

ناقد کی روح نے کہا۔" شرافت سے تو میرا نظریاتی اختلاف ہے۔"

محقق کی روح نے بہت غور و فکر کے بعد بتایا کہ" شرافت ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔"

صحافی کی روح نے کہا۔" اگر آپ مجھے شرافت کا پتہ بتا دیں تو میں اُس سے خصوصی انٹرویو لے لوں۔"

باغی کی روح نے کہا۔" ہم شرافت میں بھٹک رہے ہیں۔"

ایک انتہائی سیدھے سادے آدمی کی روح بڑی خبیث نکلی۔

انسانی سماج کے تقریباً ہر نمائندے کو پرکھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں شرافت موجود نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری۔

اعداد و شمار کے مطابق غریب غرباً میں تھوڑی بہت پھیلی شرافت کے آثار ملے۔ مجبوروں میں غیر مطمئن حد تک اس کے جراثیم پائے گئے۔ قاتلوں اور طوائفوں تک میں اس کی کچھ خو بو ملی مجبوراً

ہم نے طریقۂ تحقیق تبدیل کر کے دنیا بھر کے کروڑوں نام نہاد اچھے لوگوں کی خفیہ فہرستیں تیار کیں۔ مختلف معیار و اطلاعات، کی بنیاد پر انہیں گھٹاتے گھٹاتے لاکھوں، ہزاروں، سیکڑوں، یہاں تک کہ درجنوں تک لے آئے۔ آخر میں ایک درجن ایسے بھلے مانسوں کی فہرست تیار کی جو بن مانسوں سے مختلف تھے اور جن کی شرافت کی قسم فرشتے تک بلاتکلف کھا سکتے تھے۔ بہ مشکل ہم شرافت کے نقطۂ انجماد تک پہنچے۔ یعنی دنیا کا ایک نمبر کا شریف اپنی تجربہ گاہ میں لے آئے۔

ہم اس ذات شریف سے بے حد نروس تھے۔ کیوں کہ یہ دنیا کی شرافت کا آخری ٹسٹ تھا۔ ہم شرافت کا ایٹم بم داغنے جا رہے تھے۔ اس دنیا کے آخری شریف آدمی کی روح سے ہم نے پوچھا۔ "زندگی میں کس موقع پر آپ نے سب سے زیادہ شرافت دکھائی تھی؟ روح نے کہا، بچپن تک، جب پالنے میں ہاتھ پاؤں مارتی تھی۔ اُس وقت تک مجھ میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔"

"سنِ شعور پر پہنچنے کے بعد کی کیفیت بتائیے؟"

"جوانی کا تعلق شرافت نہیں شرم سے ہوتا ہے!"

"ادھیڑ عمری؟"

"وہ تو اس سے بھی زیادہ بے شرمی کی تھی۔"

"معاف کیجئے گا۔ مگر یہ جو دنیا بھر میں آپ کی شرافت کے ڈنکے پٹ رہے ہیں؟"

روح نے بے رُخی سے جواب دیا۔ "سب ڈھونگ ہے۔ دکھاوا، سوانگ اور فریب ہے!"

"آخر آپ کے جو یہ اتنے بڑے بڑے خیراتی اسپتال ہیں؟ جن میں نہ جانے کتنے مریض شفایاب ہوتے ہیں۔ اتنے بہت سے اسکول، کالج جہاں ہزاروں طلبا و طالبات دولتِ علم سے بہرہ ور ہوتے ہیں؟"

اس نے انتہائی بے روح ہو کر کہا:

یہ تو جناب بزنس ہے۔ بھلا اس کا شرافت سے کیا تعلق؟ یہ تو ٹیکس ماری کے سائن بورڈ ہیں۔"

"پھر بھی آخر اتنی خواتین کو آپ خدمتِ خلق کا موقع دے رہی ہیں۔ باعزت ذریعہ معاش۔۔۔"

روح نے تڑپ کر کہا:

"انہی سے پوچھیے کہ شرافت کے نام پر ان سے کیا کیا ناجائز فائدے ہم اٹھا رہے ہیں۔"

"آپ کی شرافت کی ایک عالم میں جو دھوم ہے اس کی آخر کچھ تو اصلیت ہو گی؟"

"مسٹر! ظاہر میں باطن کی تلاش بے سود ہے۔ شرافت دھوم دھام کی شے نہیں جس سے ایوانوں کو سجایا جا سکے۔ اسے تو بنی نوع انسان پسپا کر چکے ہیں۔ دنیا سے شرافت ختم ہی سمجھئے۔ کبھی کبھی شرافت گندی بستیوں میں ایڑیاں رگڑ رہی ہے، جیل خانوں میں سڑ رہی ہے۔ ویرانوں میں بھٹک رہی ہے۔ عشرت گاہوں میں سسک رہی ہے یا ایوانوں میں دم توڑ رہی ہے۔"

ہم نے اس کے خاص خاص کارنامے یاد دلائے۔ وہ بولی:

"وہ شرافت نہیں ریاکاری تھی۔ دنیاوی کامیابی کے لئے شرافت کے نام پر بڑی رذالت کرنی پڑتی ہے۔" روح نے انتہائی بے چین ہو کر کہا۔

"شرافت کا لبادہ بہت تکلیف دہ ہے اسے اُتار دیجئے، پھر میری روح میں جھانکئے۔ باطن کے آئینے میں۔ شاید چھوٹی سے چھوٹی شرافت کا پرتو بھی نہ ملے۔

ہم نے اس کی شرافت کا لبادہ اُتار کر اس کی روح میں جھانکا۔ ہمارے نزدیک جو دنیا کا سب سے شریف آدمی تھا وہ بڑا قاتل، عیار، مکار، فریبی، جواری، سیاستداں، عیاش اور موذی نکلا۔ ہمارے شرافت پیما کے سگنل نے بھی اس کی تصدیق کی۔ مجبوراً دنیا کے سب سے شریف آدمی کو ہم نے اس کے قالب میں واپس کر کے چلتا کر دیا۔

ہم نے سوچا دنیا بھر میں شرافت تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ لاؤ ذرا اپنے آپ کو ٹٹولیں

کہ خود ہم میں کتنی شرافت ہے۔ تمام ماہرینِ مسمریزم کی روحیں بلائی گئیں۔ سب کی سب انتہائی خبیث نکلیں۔ بلکہ دو ایک تو ہم میں بد روحیں تھیں۔ اپنی شرافت کا بھانڈا پھوٹنے کے بعد ہم نے شرافت کی تلاش ختم کر کے اقوام متحدہ کے لئے اپنی رپورٹ تیار کر کے اخباروں میں اشاعت کے لئے جاری کر دی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ :

"دنیا میں پہلے یہ شے بکثرت عام تھی پر اب پائی نہیں جاتی۔ کیوں کہ صدیوں قبل انسان اپنے وسیع تر مفادات کی خاطر شرافت کو جگ نکالا دے چکا ہے۔ اس کی واپسی کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو عالمی پیمانے پر کامیاب بنایا جائے"

اخباروں نے ان سرخیوں کے ساتھ ہماری رپورٹ شائع کر دی :

"قدیم انسان کی پس ماندگی کا ایک رُخ —— اس میں شرافت بھی پائی جاتی تھی۔
۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کی مدد سے واپسی کی ناکام کوشش۔

—— ❖ ——

جنّت سے واپسی

جنّت میں داخلے کا اگلا اُمیدوار ایک کلرک تھا۔

ایک فرشتے نے کلرک کے اعمال کی فائل دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دنیا میں کیا کرتے تھے ۔؟"

"جی کلرکی ۔"

"کس محکمے میں ۔؟"

"جی! پراویڈنٹ فنڈ کمشنر کے دفتر میں کلرک تھا۔"

پراویڈنٹ فنڈ کلرک کا نام سنتے ہی ریٹائرڈ مرحومین کی ایک فوج اسے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

ایک بڑے میاں بولے۔

"خوب پہچانا! جب اس کو "حق" نہیں ملا تھا تو میرے فاقوں اور ضعیفی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے میرے کاغذات پر کئی اعتراضات کر دیئے تھے۔"

ایک بوڑھے نے چلا کر پوچھا۔

"مجھے پہچانتے ہو؟ میری آخری پونجی تمہارے دفتر کے چکّر لگانے میں ختم ہو گئی تھی۔"

ایک بڈھے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہاری میز کے سامنے دم توڑ دیا تھا۔ اس پر بھی تم نے میرے کاغذات پر مزید اعتراض لگا کر کئی سال تک میرے بچوں کو بھوکا دوڑایا تھا۔"

ایک ضعیف آدمی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"میں اس سیاہ قلب کو پہچانتا ہوں، میرے ریٹائر ہونے کے پانچ سال بعد تک یہ مجھے ہوا میں دوڑاتا رہا۔ آخر ملک الموت کو ترس آگیا مگر اسے نہ آیا۔"

ایک "اولڈ مین" نے طنز کرتے ہوئے ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

"یو مسٹر پراویڈنٹ فنڈ کلارک صاحب کو آپ لوگ کیوں "ہیرس" کر رہے ہیں، ان کا تو دس پرسنٹ کا بھاؤ کھلا ہوا تھا۔ "ٹوئنٹی فور آور" میں چیک ہاتھ میں تھما دیا تھا۔"

دوسرے نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

"مجھے پہچانتے ہو بچا؟ ــــ میں نے ہی تمہیں رشوت لینے کے جرم میں ہتھکڑی پہنا کر جیل پہونچایا تھا۔ کیوں؟ کلرک ہو کر ایک کلرک سے رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے تھے نا۔؟"

تیسرے نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو عوامی حکومت تمام بدعنوانیوں سے نپٹ رہی تھی۔ یہ بھی اس لپیٹ میں آگیا تھا، مگر جب تک نہیں دھر اگیا تھا اس نے بڑی دھول اڑائی تھی۔

چوتھا بولا۔

"بس تکاتی میں آگیا تھا ورنہ نہ جانے کتنے بے گناہوں کی روحیں قبض کرتا۔ پانچویں نے کہا۔ "پراویڈنٹ فنڈ کلرک کاہے کو تھا ملک الموت تھا۔"

ایک ریٹائرڈ بزرگ نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

"پکڑا نہ جاتا۔ جب کوئی پراویڈنٹ فنڈ کمشنر یا افسروں کے پاس جاکر رونا روتا تو وہ بیچارے بڑے خلوص سے فنڈ دلوانے کی کوشش کرتے۔ مگر یہ اپنے حق کے چکر میں قصائی بن جاتا اور ایسے ایسے اعتراض لگاتا کہ فنڈ پانے والا فنڈ کی آرزو میں دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ مگر فنڈ کے کاغذات اس کی میز سے نہ کھسک پاتے۔"

بدعنوان پراویڈنٹ فنڈ کلرک کو قریب تھا کہ مجمع گھیر کر مشتعل ہو جاتا کہ اتنے میں فرشتوں نے ہوا میں گرز لہرا کر جنت کے اُمیدوار مجمع کو منتشر کر دیا۔ فرشتے نے پراویڈنٹ فنڈ کلرک کی فائل دیکھتے ہوئے اعتراض کیا کہ "تمہارے کاغذات مکمل نہیں۔ پہلے پانچویں آسمان سے جاکر اس بات کا تصدیق نامہ لاؤ کہ تم ہی پراویڈنٹ فنڈ کلرک ہو۔"

یہ سن کر کلرک بہت نروس ہوا کیوں کہ چھٹے آسمان سے پانچویں آسمان تک کا فاصلہ ایک ہزار کائناتی سال ہوا۔ کلرک نے گڑگڑا کر کہا۔ "حضور بہت دوڑنا پڑے گا۔ فرشتے نے بے رخی سے کہا۔ "جو شخص زندگی بھر دوسروں کو دوڑاتا رہا ہو اس کو خود بھی کبھی کبھی دوڑنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

اتنے میں ایک انتہائی گرجدار صدا غیب سے آئی۔

"حکم کی فوراً تعمیل ہو۔ ورنہ مردودِ آسمان کر کے فلک اوّل پر پھینک دیئے جاؤ گے کلرک۔!"

رضوان کی آواز سنتے ہی کلرک تھر تھر کانپنے لگا۔ کیونکہ فلک اوّل سے فلک پنجم تک کی راہ دس ہزار کائناتی سال کی تھی۔

کلرک جیسے ہی گرتا پڑتا بگٹٹ روانہ ہوا، بوڑھوں کے مجمع نے سخت ہوٹنگ کی۔

"پراویڈنٹ فنڈ کلرک پھنسا ہے۔!"

"بہت دوڑاتا تھا۔ اب دوڑ رہا ہے۔!"

"ایک ہی اعتراض میں حلیہ ٹائٹ ہوگیا۔"

"ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔"

"فرسٹ راؤنڈ ہے۔"

کلرک کے پیچھے چلے کٹے فقرے مدھم ہوتے گئے، وہ چلتا گیا، چلتا گیا۔ پیروں میں چھالے، حلق میں کانٹے، آنکھوں میں جالے، زندگی بھر اعتراض کرنے پر لعنت بھیجتا، روتا پیٹتا چلا جا رہا تھا، یہاں تک کہ منزلِ مقصود دکھائی دی۔ گھسٹتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ حواس جواب دے چکے تھے، روح شل ہو چکی تھی۔ جب وہ فلک پنجم پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بہار کا مہینہ ہے جس میں دفاتر بند رہتے ہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔

ایک ماہ کے مسلسل انتظار کے بعد دفاتر کھلے۔ پہنچنے کے بعد دستور کے مطابق جب وہ فرشتوں سے گلے ملنے کے لئے بڑھا تو فرشتے یہ کہہ کر کراہیت سے پیچھے ہٹ گئے کہ "ہم کسی بدعنوان پراویڈنٹ فنڈ کلرک سے گلے نہیں مل سکتے۔"

ایک فرشتے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "گلے کاٹنے والے سے گلے کیسے ملا جا سکتا ہے؟"

مایوس کلرک جب دفتر تصدیق پہنچا تو متعلقہ فرشتے نے اس کی فائل دیکھتے ہوئے اعتراض کر دیا کہ "فلک ہشتم سے اپنا ٹوکن لے کر آؤ تب ہی تصدیق ہو سکتی ہے کہ تم ہی پراویڈنٹ فنڈ کلرک ہو۔"

کلرک نے گڑگڑا کر کہا۔ "حضور آپ میری فائل سے تصدیق کر سکتے ہیں کہ میں ہی وہ بدنصیب کلرک ہوں۔"

فرشتے نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"زندگی بھر لوگوں کی ذاتی فائلوں سے جو کسی کی تصدیق نہ کر سکا ہو، اس کی تصدیق کیسے بلا ٹوکن کے کی جا سکتی ہے۔"

کلرک پھر اُفتاں وخیزاں فلک ششم کی جانب روانہ ہوا۔ انتہائی مصیبتوں سے جب وہ دوبارہ پہنچا تو متعلقہ فرشتے نے اس کی فائل دیکھتے ہوئے اعتراض کیا۔ "فلک پنجم کا ٹوکن جب لاؤ گے تب ہی تو فلک ششم ٹوکن جاری کرے گا۔"

حکم کے مطابق کلرک پھر لرزتا ہوا روانہ ہوا۔ جب بہ صد خرابیٔ بسیار فلک پنجم پر پہنچا اور ٹوکن حاصل کر کے فلک ششم واپس آیا تو اس کا ٹوکن بدل گیا۔ جب اس کے بدلے تصدیق نامہ لے کر واپس پہنچا تو فرشتوں نے بتایا کہ ــ" اس کے اعمال کے مطابق اسے عام معافی کی آخری منزل تک مستقل دوزخ ہی میں رہنا ہوگا۔"

ابھی وہ اس آخری اعتراض کا کوئی جواب ہی دینے والا تھا کہ داروغۂ جہنم کا ایک گرز اس پر پڑا اور وہ پاش پاش ہوگیا۔ دہکتے ہوئے جہنم میں جیسے ہی گرا تو ایک بھیانک چیخ کے ساتھ پراویڈنٹ فنڈ کلرک کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پلنگ کے بجائے زمین پر مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

اس کی بیوی گھبرا کر دوڑتی ہوئی آئی اور پوچھنے لگی۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

کلرک جلدی سے دھول جھاڑتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اصل معاملہ چھپاتے ہوئے بیوی سے جلدی سے پوچھا۔ "وہ پیسہ دینے کے لئے جس آدمی نے صبح آنے کا وعدہ کیا تھا وہ آیا یا نہیں ــ؟"
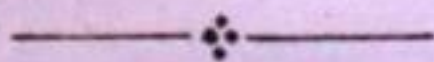
کتاب کی جلد

ہمارے بچپن میں کتاب کی جلد بہت مضبوط واقع ہوا کرتی تھی۔ ایک بھائی کے ہاتھ میں "علی بابا چالیس چور" ہوتی تو دوسرے کے "ٹھگوں کا بادشاہ"۔ بلاتکلف گھنٹوں پنگ پانگ کھیلا کرتے۔ تھک گئے تو کتاب کھول کر قصّہ پڑھنے لگے۔ تازہ دم ہوئے تو پھر کتاب بلاّ بن گئی۔ بھائی بہنوں میں جنگِ مغلوبہ ہوتی تو "الف لیلیٰ" اور "ہزار داستان" جیسی ضخیم کتابوں سے جوابی حملے کئے جاتے۔ کیا مجال جو کبھی کوئی کتاب شہید بھی ہوئی ہو۔

گھر میں سبھی کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ اس لئے کتابوں کو جا... کے بعد ان سے دسترخوان کا بھی کام لیا جاتا۔ ہمدرد، کامریڈ اور ہمدم کی فائلوں پر ہمیں بیسیوں بار کھانے اور اخبار سے دسترخوان کا کام لینے کا شرف حاصل ہے۔ اکثر ڈھکن غائب ہو جانے کی صورت میں گھڑے پر "اسٹوڈنٹس پاکٹ ڈکشنری" ڈھک دی جاتی۔ بارہا بیمار کا نسخہ کتاب کی جلد میں اور دوا کتاب پر رکھ دی جاتی۔ کسی نے پوچھا "نسخہ کہاں ہے؟" جواب دیا "گلستاں میں"۔ نولکشور پریس کی باتصویر "گلستاں" کی جلد اتنی مضبوط تھی کہ بھائی لوگوں نے گھریلو سینما کے لئے اس کی تمام اہم تصویریں کاٹ لی تھیں۔ پھر بھی جلد کی شکل میں شیخ سعدیؒ باقی رہ گئے

اور اکثر بھٹہ بھوننے میں مدد دیتے رہے۔

اللہ بخشے ماموں جان کو، مرحوم علامہ یاد بریلوی تخلص کرتے۔ کبھی اپنے کمرے میں کسی کو پھٹکنے تک نہ دیتے جب علامہ دسادر کے مشاعرے میں ایکسپورٹ ہوتے تو ہم لوگ چپکے سے ان کے کمرے میں گھس کر ریل ریل کھیلتے۔ "قاموس، منجد، سکندرنامہ، اخلاق جلالی، اخلاق ناصری اور کیمیائے سعادت" وغیرہ کو بطور ریل کے ڈبوں کے استعمال کرتے۔ انجن کے طور پر سب سے آگے "شاہنامہ" فٹ کیا جاتا اور "قرابادین" گارڈ کے ڈبے کے کام آتا۔ دن بھر کتابوں کی اٹھا پٹک اور کتابوں پر بیٹھ کر انھیں کھسکانے کا سلسلہ جاری رہتا۔ مگر کیا مجال کہ کبھی کوئی جلد کہیں سے مسکی بھی ہو۔ دراصل اس زمانے میں بچوں کا دل رکھنے کے لئے "جائلڈ پروف" یا "ناٹی بوائے" قسم کی چرمی جلدیں باندھی جاتی تھیں۔

ہم پہ جوانی آئی تو جلدوں پر بڑھاپا آگیا۔ وجہ ہماری جوانی نہ تھی۔ بلکہ کتابوں کا مانجھا ڈھیلا تھا۔ دراصل فنکارانہ جلدوں کی جگہ کاروباری اور پھر کام چلاؤ جلدوں نے لے لی تھی۔ اس کے بعد دو نمبری کا فیشن چلا تو چلتاؤ جلدیں بھی دو نمبری بننے لگیں۔

نئی قسم کی جلدوں میں جلد ساز سے زیادہ خریدنے والوں کا تصور ہے۔ پرانی جلدیں تو پڑھنے والے خریدا کرتے مگر نئی جلدیں لائبریریوں کے لئے باندھی جاتیں۔ جہاں اچھی بھلی کتاب کا سرورق نمائش کے لئے اور کتاب جلد باندھنے کے لئے بھیج دی جاتی۔ اس خوف سے کہ قاری غلطی سے کتاب خرید کر مصنف کے بارے میں رائے خراب کرلے۔ قیمتیں آسمان سے بھی بلند کردی گئیں کہ نہ پہنچ پاؤ نہ خرید سکو۔

لائبریری جلد نہیں کمیشن کی شکایت کرتی ہے۔ اس لئے ماہرین کتاب پرور نے قاری کا خطرہ ختم کرنے کے لئے یہ اصول بنادیا کہ "خبردار! کوئی قاری کتاب نہ خریدنے پائے۔"

جس کا خوشگوار اثر یہ ہوا کہ پڑھنے والی مخلوق یا تو ناپید ہو گئی یا لائبریریوں میں پناہ گزیں۔ رہ گئے شاعر، ادیب تو انہیں اپنی قیمتی تحریروں کے مطالعے سے کہاں فرصت کہ دوسروں کو پڑھ کر اپنی اوریجنلیٹی پہ بٹہ لگا دیں۔ کافی ہاؤس میں بیٹھنے کے بعد پڑھنے کی یوں بھی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

جب دو نمبر کا زمانہ آیا جلدوں میں مضبوطی کی جگہ حسن و نزاکت اور نفاست نے لے لی تو جلد بندی کی رہی سہی کسر جدید آرٹ نے پوری کر دی جس سے فوری فائدہ یہ ہوا کہ کتاب پر نظر کے بجائے ترچھی نظر پڑنے لگی اور وہ بھی آرٹ نہیں کتاب کی ہوشربا قیمت پر۔

کتاب کی بہت سی منزلیں ہوتی ہیں، مگر جلد کی صرف ایک کہ اس کا انتہائی محنت سے مطالعہ کرنے والا ہو۔ مطالعہ ایک ایسا ذہنی عمل ہے جس میں قاری اور کتاب میں باقاعدہ کشتی ہوا کرتی ہے اور دونوں کی قلعی ایک دوسرے پر کھل جاتی ہے۔ پڑھتے پڑھتے زور پڑا تو کتاب دونا ہو گئی۔ کوئی کام نکل آیا تو کتاب بغل میں۔ ڈاکٹر کے یہاں نمبر آنے یا دوا لینے میں دیر ہے تو کتاب جیب سے نکالی اور پڑھنے لگے۔ بہت سے لوگوں کو خوش فہمی ہے کہ صرف جاسوسی ناول بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ اور داستان پڑھنے والے کو کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا۔ ہم نے نہایت خشک اور ٹھوس تحقیقی کتابیں نیاز فتحپوری، کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کو اس طرح پڑھتے دیکھا ہے کہ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا، سرہانے جلد رکھی ہے تو پائینتانے کتاب کا پڑھا ہوا حصہ، زیر مطالعہ حصے کو بٹیر کی طرح ہاتھ میں دبوچے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے کاظم علی خاں کو پڑھتے نہیں دیکھا تو پھر کچھ نہ دیکھا۔ ان کے مطالعے کا طریقہ نہایت پُر اسرار ہے۔ پہلے وہ کتابوں کے چھوٹے بڑے چبوتروں کا حلقہ اپنے گرد بنا لیتے ہیں، ہر چبوترے کو مواد کی تاریخی ترتیب کے اعتبار سے سجاتے ہیں۔ ہر بار اٹھ کر الماریوں کے تالے کھولتے

کتابیں نکالتے اور تالے بند کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے پڑھنے کے کمرے کی
کنڈی اندر سے بند رہتی ہے۔ اس کے باوجود تالے پر تالہ اس پر تالہ اور پھر تالہ، غرض اوپر
تالے اندر کتابیں۔ گویا کتاب نہیں بینک کے اسٹرانگ روم سے کرنسی نکالی جا رہی ہے۔ پھر
بڑے اہتمام سے ان کتابوں کے بیچ میں حقّہ رکھا جاتا ہے۔ تاؤ تیز کرنے کے لئے مخطوطات،
سے پنکھے، دھونکنی اور پھونکنی کا کام لیا جاتا ہے۔ اس شان سے علمی و تحقیقی تخت پر جلوہ افروز ہوا
کرتے ہیں کہ اگر موسم معتدل ہے تو بنیائن اور تہمد جس پر تہمد کی تہمت ہے۔ خدا نہ کرے کہ موسم
گرم ہو تو پھر لباس۔ گرمی تحقیق کی تاب بھلا کہاں لاسکتا ہے؟

موصوف نے ایک جلد اٹھائی اسے کھا جانے والی نظروں سے پڑھا سناٹے میں آگئے۔
اچھل پڑے۔ بڑبڑائے، مصنّف کا شجرہ نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ حقّے سے بیان
کیا۔ غصہ سے بھنویں تن گئیں "بکواس" کے فلک شگاف نعرے کے ساتھ کتاب اتنے زور سے
پھینکی کہ اس کونے میں کتاب، اور اس کونے میں جلد گری۔ یا ہاتھ ہی میں رہ گئی۔ پھر کسی
مخطوطے میں غرق ہو گئے، تاؤ کم ہوا تو جلدی سے کچھ بلغم اور کچھ جسم کو ہوا دی۔ کہیں بدن اس سے
کھجلا لیا۔ ماتھے کا پسینہ اس طرح صاف کیا جیسے مہتر پنجے سے نالی صاف کرتا ہے۔ کھانے کا وقت
گزرنے لگا تو بیگم صاحبہ نے ڈرتے ڈرتے یاد دلایا۔ اتنے زور سے گھڑکا۔ "مجھے غالب کے
شاگرد میر مہدی مجروح کے پرنواسے کی تاریخ پیدائش نہیں مل رہی ہے اور تمہیں کھانے کی پڑی
ہے۔" بیچاری سہم کر رہ گئیں۔ رئیس التحقیق پھر غلام رسول مہر اور مالک رام کی جلدوں
میں ڈوب گئے۔

سب سے پہلے کتابوں کے ڈھنگے کور دریافت کئے گئے۔ اندر ایک چھاپ کی دفتی
جس پر جلد کی تہمت اوپر مریل سا پتنگی کاغذ جلد کے اندر آدھا انچ مڑا ہوا۔ کتاب کھولنے پر جلد

سے کوَر اس طرح نکل جاتا جیسے کسی نے جلد کا ازار بند کھول کر جلد کو عریاں کر دیا۔ مگر یہ سب باتیں اُس زمانے کی ہیں جب لوگ کتاب خرید کر پڑھتے تھے۔ اگر کتاب اس کی غفل سے کبھی موٹی ہوتی تو اس کوَر سے "بک مارک" کا کام لیتا۔ یا بچے ناؤ بنا کر پانی میں اپنے ہاتھ سے تیراتے۔ صاحب کتاب کو چنداں کوفت نہ ہوتی۔ کوَر ڈوبا تو کیا ہوا۔ بچوں کا گھڑی بھر دل تو بہل گیا۔ اگر کتاب دریا بُرد بھی کر دیتے تو ماتھے پر شکن نہ آتی۔ مہدی افادی جب تک نفیس جلد نہ بندھواتے کتاب کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ ابتدائی چند صفحات فیصلہ کر دیتے کہ کتاب لائبریری میں رکھی جائے یا ردّی کی ٹوکری سے جلد نکال کر بنیے کی دکان تک پہنچا دی جائے۔

ٹیڈی جلدوں کو ناؤ کی طرح موڑ کر بہ آسانی جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔

پتہ نہیں چل پاتا کہاں سے جلد شروع ہوئی ہے۔ اور کہاں پر کتاب کی سرحد واقع ہے۔ سنگم کہاں ہے۔ کتاب میں جلد ہے بھی یا محض "ہارڈ کوَر" ہے۔ یا ساری الجھن اس وجہ سے ہے کہ "کوَر سافٹ" ہے۔

فی زمانہ اچھی کتاب کی یہ پہچان ہے کہ وہ جعلی ہو۔ مگر آپ اُسے پڑھنے کے لئے بے تاب یا مجبور ہوں۔ جعلی ایڈیشن کی شانِ نزول یہ ہوتی ہے کہ کاغذ اس سے خراب نہ مل سکا۔ اس سے سستا کاتب میسر نہ آسکا۔ جلد بس منڈھ دی گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اسے پڑھنے کے لئے غیر معمولی بینائی اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے کہ مشکل ہی سے کام نکالا جا سکے۔ تقریباً بیشتر کتب فروش انتہائی اہم بیرونی کتب کے انتہائی اہم جعلی ایڈیشن نفع کے اہتمام سے چھاپتے۔ بلکہ کاغذ کالا کر کے ہوش ربا قیمتیں اینٹھتے رہتے ہیں۔ کچھ متنازعہ فیہ کچھ نصابی اور کچھ اہم کتابوں کا حشر میدانِ حشر سے پہلے ہی برپا کر دیتے ہیں۔ جوش صاحب کی "یادوں کی بارات" کا اصلی ایڈیشن دیکھئے تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ مگر دستیاب ایڈیشن پڑھنے سے فاضل مصنف کی اُردو تک

مشکوک ہوجاتی ہے۔ کوئی جملہ لنگڑا رہا ہے، تو کوئی ہکلا رہا ہے۔ ابن انشا کی "اردو کی آخری کتاب" کا اصل ایڈیشن حسن و جمال میں دلہنوں کو شرما دیتا ہے۔ مگر جعلی ایڈیشن سے اندازہ ہوتا ہے کہ خرابی میں بھی کس قدر خرابہ ہو سکتا ہے۔ یوسفی اگر "چراغ تلے" کا فٹ پاتھ ایڈیشن دیکھ پائیں تو اتنا ضرور سمجھ جائیں کہ "آنکھوں میں خون اترنا" کے آخر معنی کیا ہوتے ہیں۔

کتابیں اب صرف پیٹ کی خاطر چھاپی جارہی ہیں یا توند بڑھانے کے لئے۔ ایک دفعہ بھی پڑھنے پر کتاب تار تار اور جلد کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اگر کتاب قاعدہ کی طرح اہتمام سے سامنے رکھ کر پڑھی گئی تو غنیمت اگر بے خیالی میں موڑ دی تو دفتیاں جھولنے لگیں گی اور ختم ہوتے ہوتے تک کور سرمہ دفتی ملیدہ اور کتاب بھوسا ہو جائے گی۔ جب ہم نے ایک ممتاز ناشر سے جلدوں کی زبوں حالی کی دبے لفظوں میں شکایت کی تو وہ یوں گویا ہوئے:

"صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اس مہنگائی میں کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ اس طرح تو ہو چکا آپ کا پڑھے لکھوں میں شمار اور ہو چکا گزارا۔ اللہ شوق دے تو پہلے جلد بندھوائیے۔ ایک پڑھائی تک تو ساتھ دے ہی دے گی۔"

ہم نے پوچھا۔ "آخر آپ پڑھا لکھا کسے کہتے ہیں؟" وہ چمک کر بولے۔ "جس شاعر، ادیب نقاد وغیرہ کو کوئی بہت بڑا عہدہ مل جائے۔ بس ہو گیا وہ سب سے بڑا۔ اور اگر اپنے ساتھیوں کو زندہ درگور کر کے صدر شعبۂ اردو ہو گیا تو بس ہو گیا سب سے بڑا پڑھا لکھا۔ "محمد فاضل"۔ ہم نے کہا "معاف کیجئے گا! بڑے عہدے داروں اور صدر شعبہ جات ہائے اردو کے بارے میں آپ کی رائے خاصی مشکوک ہے۔"

ناشرانہ شان سے اینٹھتے ہوئے گھڑک کر فرمایا۔ "میاں جن کے علم و فضل کے ڈنکے پٹے ہوئے ہیں ان کو کوئی تازہ کتاب بطور مصرعہ طرح عنایت کر دیجئے مطلع ہی میں غبارے کی ہوا نہ

نکل جائے تو میرا ذمہ۔!"

ہم نے پوچھا "مالی حالت سے آخر آپ ادبی حالت کو ملانے پر کیوں مُصر ہیں۔" بولے۔
"ان علاقوں پر غور کیجیے جو نامور یعنی لکھ پتی شاعر ادیب پیدا کرتے ہیں۔ شاعروں کی بین الاقوامی ٹیم
تیار کرتے ہیں جن کا اب نام نہیں کلمہ پڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ برخوردار اس مہنگائی میں
اگر آپ کی ماہوار آمدنی پانچ ہزار سے کم ہے تو کوئی دوسرے درجے کا نقاد بھی آپ کا نام تو لینے
سے رہا۔ نقاد غریب ادب کو تو کھاتا نہیں۔ کھاتا تو آخر شاعر ادیبوں کو ہی ہے۔ پھر اگر ادب کے
نام پر ہم ان کے جعلی ایڈیشن چھاپ کر کھا لیتے ہیں تو کیا ستم کرتے ہیں؟"

اس ستم ظریفی پر ہمیں یاد آیا کہ لیسنگ (LESSING) کی عقلمند ناتھن (NOTHAN
THE WISE) ہمیں اتنی پسند آئی کہ ہم نے بزبانِ اردو اس کا ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۷۸۱ء
میں انگریزی زبان میں اتنا ابہام تھا یا وہ یورپ کی جملہ زبانوں کی کھچڑی تھی اس کا اگر شبہ بھی ہو جاتا
کہ انگریزی کے معنی اطالوی، یونانی، ہسپانوی، فرانسیسی وغیرہ بھی ہوا کرتے ہیں تو ہم فیصلہ واپس
لے لیتے۔ دشواری یہ تھی کہ اولین سو صفحات جہازی جو عقل و نقد، تاریخ و معلومات کا بیش بہا
خزانہ تھے، کنگ ریڈر، ریڈر کی طرح سادہ آسان اور رواں تھے۔ جن کو ہم نے فرفر ترجمہ بھی
کر ڈالا۔ اب ہماری حالت اس جہاز کی تھی جو ساحل کے نزدیک لنگر انداز ہو۔ پر کنارا دور ہو۔

مجبوراً ہم نے بابائے اردو کی "انگریزی اردو لغت" یعنی "بابا" کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔
گاہے گاہے یونانی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، لاطینی وغیرہ لغات پر بھی تکیہ کر لیتے۔ بیٹھ کر،
لیٹ کر، ٹہل کر، سر کو ہاتھوں سے پکڑ کر، ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر، ہوا میں ہاتھ لہرا کر، فکر میں
غرق ہو کر کتاب کے ان نازک مقامات سے بدقت تمام گزرتے بلکہ کھسکتے رہے۔ الجھن اور
ذہنی کشمکش کی جتنی بھی قسمیں ہو سکتی ہیں وہ سب ہم پر آئینہ ہو گئیں۔ آئینہ بھی شرمانے لگا۔

لوگوں نے ہمارے حلیے اور صحت کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع کردیں۔ ڈاکٹر کو دکھانے پر زور دیا۔ سب باتوں سے لاپرواہ ہم جونک کی طرح "بابا" سے چمٹے ہوئے کتاب کا پری کرما کرتے رہے۔

ابھی ہم نے کتاب کے ابتدائی دس صفحات کا ترجمہ کیا تھا کہ "بابا" نے ساتھ چھوڑنا شروع کردیا۔ جلد کی دونوں دفتیاں اس طرح جھولنے لگیں۔ جیسے مرنے سے کچھ پہلے گدھ اپنے دونوں ڈینے ڈال دیتا ہے۔ ہمارے ایک مہمان جو کھانا کھاکر برآمد ہوئے تھے بابا کی پشتی جو اب اُدھڑ چکی تھی اور جزبندی کی سلائی کے جُھنجھڑے نکل آئے تھے انھوں نے بڑی بے تکلفی سے ایک تاگا توڑ کر دانتوں کے آر پار خلال کا عمل شروع کردیا تو ہمارا خون ہی تو کھول گیا۔ بس پی گئے۔ آگے عبارت کچھ ایسی بے ڈھب تھی کہ ہماری ترجمے کی گاڑی اس طرح رُک گئی تھی گویا مختلف انجانی زبانوں نے مل کر اس کی زنجیر کھینچ لی ہو۔

کتاب میں کچھ عبارت ایسی آگئی تھی کہ معلوم ہوا کہ ڈکشنری نہیں کوئی وکیل ہی ان اصطلاحات کو بتا سکتا ہے۔ وکیل صاحب نے مشورے کی فیس طلب کرلی۔ مگر ایسا سمجھایا اور بتایا کہ ہم فیس ادا کرنے کے باوجود پھڑک اُٹھے۔

فاضل مصنف کو شاید علم تھا کہ دو سو سال بعد ہم اس نخر روزگار کو اردو میں پیش کریں گے۔ اور اس سلسلے میں ہمیں مسلسل زحمت نہ ہو۔ اس لئے اچانک وہ خالص، سادہ اور آسان انگریزی پر اُتر آیا تھا۔ انداز بیانیہ تھا۔ اور وہ فر فر بیان کرتا کینیڈین انجن کی طرح تیز گام اُڑا چلا جا رہا تھا۔ سو صفحات ہم نے بہ آسانی ترجمہ کر ڈالے یہاں تک کہ مصنف پر پھر قابلیت کا دورہ پڑ گیا۔ اور گاڑی جام ہوگئی۔ بابا کی حالت ورق ورق تھی۔ اگر پنکھا تیز ہو جاتا یا ہوا کا جھونکا آتا تو ان کے پرزے اُڑنے لگتے۔ سہولت کے اعتبار سے ہم نے حروف تہجی کے لحاظ

سے ڈکشنری کی گڈیاں بنا کر پیپر ویٹ بلکہ ہر وزنی شے کے نیچے دبا دیں۔ اب مصیبت یہ تھی کہ اگر "آر" کی گڈی اٹھانا پڑی تو گڈی ورق ورق، بھلا اس کی ورق گردانی کیسے کی جائے۔ معلوم ہوتا کہ ہم ڈکشنری نہیں دیکھ رہے ہیں کرنسی نوٹ گن رہے ہیں۔

تعجب اس بات پر ہے کہ عملاً بابا سے زیادہ ہم نے دوسری زبانوں کی ڈکشنریوں سے استفادہ کیا۔ جن کے اصلی ایڈیشن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مگر اس دو نمبر کی حالت یہاں تک غیر ہو چکی تھی کہ اچانک ہم پر انکشاف ہوا کہ کچھ حروف، تہجی اس میں سرے سے پائے ہی نہیں جاتے۔ خاصی چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ کسی دن ہوا سے کچھ گڈیاں اڑ کر فرش پر بکھر گئی تھیں۔ جن کو بہتر کوڑا سمجھ کر جھاڑو سے صاف کر کے کوڑے پر ڈال چکا تھا۔ کوڑے کو کریدنے پر کچھ صفحات بیشک مل گئے مگر بارش نے ان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ کچھ صفحات نہایت مشکوک حالات میں باورچی خانے سے برآمد ہوئے مگر ہمارے تیور دیکھ کر باورچی صاف مکر گیا۔ یوں بھی خراب کھانے کے علاوہ وہ کوئی دوسری ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ مجبوراً ہم بابائے اردو کا سالم جعلی ایڈیشن مکرر خرید لائے تاکہ ترجمہ کی جو غلطی شروع کی تھی اسے نباہ کر آئندہ کے لئے اس قوم کے ترجمہ سے معافی مانگ لیں جس پر اب سورج غروب ہونے لگا ہے۔

خدا خدا کر کے تین سو صفحات پورے ہوئے جس میں سے دو سو کا وکٹوریہ کراس مرحومہ کے ٹانکا جا سکتا ہے۔ مگر نئے بابا کے فیتہ بھی نہ لگایا جا سکتا تھا کیونکہ ان کے انجر پنجر بیس پچیس صفحات پر اتنے ڈھیلے ہو گئے تھے کہ دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ حادثے کے بعد ہوائی جہاز کے ملبے سے نکلنے والا مسافر جس کا سر کہیں دھڑ غائب چھوٹے بڑے کٹے پٹے آدھے چوتھائی اعضا آسانی کے لئے ہم نے بہت سے جوتے کے ڈبے میز پر سجا دیئے۔ ہر ڈبے پر کسی نہ کسی حرف کا نام جلی طور پر لکھ دیا۔ جب کوئی لفظ ڈھونڈنا ہوتا تو متعلقہ ڈبے میں معنی خیز غوطہ لگا دیتے۔

جوتے کے ڈبوں میں غوطہ خوری کا سلسلہ جاری تھا۔ اب محض آخری باب کے دس صفحات
کا ترجمہ باقی تھا۔ اسی خوشی میں سنیما دیکھنے چلے گئے۔ انٹرول ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد مزید ایک
جبری انٹرول ہوا۔ یعنی بجلی غائب ہوگئی۔ بڑی دیر بعد بجلی واپس آئی معلوم ہوا کہ طوفان آگیا تھا۔ آندھی
کا پہلا نزلہ بجلی پر گرا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو آندھی ختم ہو چکی تھی۔ آندھی کا نام سنتے ہی اندھیرے
میں پکچر چھوڑ کر نو کدم گھر بھاگا۔ طوفان آندھی کے بعد بارش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بھیگتا ہوا گھر
پہنچا۔ لائبریری کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جوتے کے سارے ڈبے غائب تھے۔ نئے اور پرانے
دونوں باباؤں کو آندھی اڑا لے گئی تھی۔ چنانچہ بقیہ دس صفحات کا میں نے آزاد بلکہ شاعرانہ ترجمہ کر دیا۔
جس کا لیسنگ سے زیادہ حالات سے تعلق تھا کیونکہ ڈکشنری کی دفتیوں سے ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔

محبوب کی فریاد

مجھے اپنی فرم "روزنامہ اینڈ روزنامہ ان لمیٹڈ" کی جانب سے بھیجا گیا تھا، تاکہ میں جلد از جلد اُردو شاعری کے روایتی معشوق سے انٹرویو لے سکوں۔ اس سے قبل بھی ٹیلی ویژن پر شو، ریڈیو پر تقریر، پبلک میٹنگ میں ایڈریس اور فلم میں ایکٹنگ کرنے کے چارمنگ آفر یکے بعد دیگرے، محبوب شکریے کے ساتھ واپس کر چکا تھا۔ "فلم فائن" جیسی مشہور و معروف فلم کمپنی نے محبوب کی زندگی پر ایک کارتونی فلم بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ ایک راکٹ ساز فرم نے چاند کی دنیا میں پہنچنے والے پہلے مسافر جہاز پر مفت سیر کے لئے ٹورسٹ سیشن کا ایک گیبٹ ٹکٹ بھی آفر کیا تھا۔

بقول شخصے اب یہ سارے "ہائی لائیٹ" میرے توسط سے انجام پانے تھے، ان کا مقصد محبوب کو منظرِ عام پر لانے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ مگر میں اپنی فرم کی پالیسی کے مطابق اس کام کو نہایت خاموشی اور رازداری سے انجام دینا چاہتا تھا۔

محبوب سے میری کس نے کس مقام پر اور کس کے سامنے ملاقات کروائی تھی، یہ میں اس خوف سے نہ بتاؤں گا، کہ شاعر اور عاشق حضرات پتہ پاتے ہی اسکی گلی کو گھیر لیں گے اور اس کے

گھر کے سامنے اپنے بستر بچھا دیں گے، ہنگامے کھڑے کر دیں گے اور اس ساری آئی گئی کی ذمہ داری مجھ ناتواں کو برداشت کرنا پڑے گی۔

محبوب نے انٹرویو تو دے دیا، مگر بقیہ چارمنگ قسم کے آفریہ کہکر ٹھکرا دیئے کہ "میرے ابّا جان اس قسم کے اسکینڈلز پسند نہیں کرتے ہیں۔"

محبوب کو سمجھنے کے لیے، اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ محبوب بالکل ایسا ہے جیسے کہ عام طور پر محبوب صاحبان ہوا کرتے ہیں۔ وہ نہایت ہوم سک، پرورٹیڈ اور امبیشس قسم کا واقع ہوا ہے۔ فی الحال وہ زیر تعلیم ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ نہایت نستعلیق یعنی گھریلو قسم کا واقع ہوا ہے۔ اس کو ڈرائینگ رُوم کے آداب اور دال بگھارنا، امرود کی جیلی بنانا، بادام کی پڈنگ تیار کرنا، سبق یاد کرنا، کشیدہ کاری و مینا کاری اور فلرٹ کرنے میں دستگاہ کامل حاصل ہے۔ اُس کے معصوم ہونے پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ فی الحال اس کو کسی عاشق یا شاعر نہیں بلکہ اُفق کے اُس پار کسی تعلیم یافتہ و برسر روزگار خاندانی چشم و چراغ کی بہت سخت ضرورت ہے۔ جس کے ساتھ زندگی کے بقیہ دن عزت و آرام کے ساتھ گذر جائیں۔ اُس کی ماورائی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کے ابّا جان اخبارات میں برابر "ضرورت رشتہ" کے کالم میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ محبوب اسکینڈلز سے بہت ڈرتا ہے مگر اس کے باوجود وہ جتنا بڑا کیریرسٹ ہے اس کا پاسنگ برابر بھی آئیڈیلسٹ نہیں ہے (برائے مہربانی شاعر و عاشق حضرات اس کو نوٹ فرمالیں) شادی کے لئے درخواستیں بھیجتے وقت یہ ہرگز نہ بھولیں کہ محض کیرکٹر سرٹیفکیٹ سے کام نہ چلے گا۔ کیونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ نوکری والی درخواستوں پر غور کیا جائے گا ڈینز اسپورٹسمین کو ترجیح دی جائے گی نکاح میں اعلیٰ سفارشوں اور درخشاں مستقبل کی ضمانت ہونا ضروری ہے۔

اب محض آپ [illegible] اس تاریخی انٹرویو کے چند اہم مختصرات اس امید پر پیش کرتا ہوں کہ آپ اسے پڑھیں اور مجھے دعائیں دیں —

آپ سے بھی کیا چوری میں اُس لیلائے زماں کو دیکھتے ہی بے حد نروس ہو گیا۔ اُس نے بڑی ادا سے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے سر پر دوپٹہ ٹھیک کیا۔ [illegible] نیلاہٹ اُس کے رُخساروں پر پھیل گئی، ہونٹوں کی سیاہی چاہ زنخداں تک کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ برقی روشنی میں اس کے لب و رخسار مثل فالسے کے چمک رہے تھے۔ میں بے تحاشا غور کر رہا تھا کہ اِن کے کمر کے علاوہ کچھ اور بھی [illegible] یا صرف کمر ہی کمر ہے۔ میرے دریافت کرنے پر اُس نے کچھ سمٹتے لجاتے اور وحشی ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! —— میں —— میں ہی معشوق ہوں!"

مجھے آپ ہی کی تلاش تھی۔"

"فرمائیے! میں کس لائق ہوں"۔ اس نے اِٹھلاتے ہوئے دریافت کیا۔

"دراصل میں ان عاشقوں اور شاعروں کے بارے میں آپ کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا، جنہوں نے آپ کو اس قدر زبردست قسم کی فری پبلسٹی دی ہے کہ آج دنیا کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں۔"

میں نے ذرا ہمت کرتے ہوئے دریافت کیا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"ارے صاحب! ان روایتی عاشقوں نے مجھے بے حد تنگ کر رکھا ہے۔ اُس سے تو اچھا ہوتا، کاش مجھے موت ہی آجاتی۔ ان کے بیان کے مطابق اگر انصاف سے دیکھا جائے تو میں اردو شاعری کا روایتی معشوق نہیں بلکہ دنیا کا آخری عجوبہ ہوں یا پھر کسی عجائب گھر

کی ہائی لائیٹ۔ ان کے نزدیک میں ہمیشہ سر پہ آسمان، بغل میں اسپوتنک اور پیر میں چکر لئے ہوئے اسپیس ٹرپوں میں مصروف رہتی ہوں۔

میرا کارٹون جو یہ بناتے ہیں۔ ذرا بنڈ آپ خود غور سے دیکھئے کیا میں خواب میں بھی اتنی بھیانک ہو سکتی ہوں۔ سر جھاڑ، منہ پہاڑ، اس قدر الجھے ہوئے بال جو بڑی محنت سے اُجاڑے گئے ہوں (اس کا شمار میک اپ میں سمجھا جائے) جن میں خواہ جوؤں اور لیکھوں کی فوجیں ریارپ پیدل مارچ کر رہی ہوں، مگر اس میں بھی ان کو خوشبو کی لپٹیں محسوس ہوں گی جو ان کے دلوں پر مثل فالج کے اور دماغ پر میری مشک بیز عنبریں زلفوں سے کولڈ ویو اور سن اسٹروکس کی طرح لگتی ہوں گی۔ خواہ میں کنگھی پہ آؤں تو جوؤں کی بارش سے مان سون کا سماں باندھ دوں لیکن یہ اس کو جوں ہرگز نہ کہیں گے۔ بلکہ شور کرنا شروع کر دیں گے کہ عاشق گر رہے ہیں۔ قتل کا بازار گرم ہے۔ طبیعت آج آمد پر ہے اس لئے محبوب کشت و خون پر آمادہ ہے۔ آج ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ کیونکہ میری قیامت سے طویل زلفیں اب ایکشن میں آ چکی ہیں۔

میرے پٹھے (بابی ہیرز) یعنی سو کالڈ (so called) زلفوں کے بارے میں افواہ ہے کہ یہ ہوا سے لہرا نہیں رہی ہیں بلکہ سانپ اور بچھوؤں میں دو بدو لڑائی ہو رہی ہے۔ گھٹاؤں کو غش آ رہا ہے اس موقع پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی آئی سائیڈ کافی ویک ہو چکی ہے۔ اس لئے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب ان کو پٹے بھی ایڑی سے رگڑ کھاتے نظر آئیں گے۔ پھر ان مارِ سیاہ میں ان کو ابدی کوندے لپکتے، گھنگور گھٹا گھر گھر کر آتی اور بجلیاں اٹھکیلیاں کرتی نظر آئیں گی مجھ سے سلسل زلفیں سمیٹ لینے کی درخواست کی جائے گی تاکہ میں چوٹی باندھ لوں، چوٹی میں موباف زری کا نہیں بلکہ شام و سحر لپیٹے ہوئے ہوں گے۔

اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ تاریکی دور ہو جائے گی اور سفرِ عشق کے مسافر منزلِ ناپیدا کنار کے دھندلکوں میں بھٹکنے سے بچ جائیں گے۔

بقول ان سر پھروں کے میں نے ظلم و ستم کے تمام گذشتہ ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ انہوں نے حور اور قصور کے درمیان میرا جو آسیبی خاکہ کھینچا ہے اس کے مطابق حسن، سنگدلی، بے وفائی، بے رُخی اور جملہ نزاکتیں ازل سے میرے نام الاٹ کر دی گئی ہیں —— میرے ہاتھ میں "ریپانس"، کے کوٹے ہیں مگر ان کو میں ایشو نہیں کرتی۔ اور جو عیب ابھی پبلک کے مزید اصرار پر بھی منظرِ عام پر پیش نہیں کئے جاتے وہ آپ کو میرے یہاں بکثرت مل جائیں گے۔

مثلاً میں آشوبِ چشم کے عارضے میں مبتلا ہوں، رتوندی آتی ہے۔ نگاہ کام نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ سینما دیکھنا محال ہے، سرکس جانا بے فائدہ ہے مگر میری گردشِ چشم پر میخانے رقصاں ہیں، زمان و مکاں کو حال آ رہے ہیں۔ دل رجز پڑھ رہا ہے۔ ع

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

بے پیئے مستی آ رہی ہے، کسی جام پر دنیا، کسی پر عقبیٰ مفت عنایت ہو رہی ہے۔ نہ جانے کس کربلا سے چلے آ رہے ہیں، پیاس ہے کہ اُمڈی چلی آ رہی ہے۔ نگاہیں ادھر اُدھر بجلیاں گرا رہی ہیں اگر اتفاق سے بھی نگاہ اُٹھ جاتی ہے تو بیٹھنے کا نام نہیں لیتی۔ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل سب کا کیریر تباہ ہوا جا رہا ہے، میری آنکھوں میں مستقل رمبا سمبا ہو رہا ہے۔ سب کے سب بے پیئے مست ہیں۔ اس وجہ سے بازار میں مشروبات کے دام گر جانے کا سخت خطرہ ہے۔ میری آنکھوں کے خمار سے زلزلے آ رہے ہیں، میخانے لرز رہے ہیں۔ میخانے الاٹ کرنے کے پھیر میں ایڈوانس بستر کھجوا دیئے گئے ہیں۔ میں ساقی گری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوں۔ جوانی، بڑھاپا، بچپنا، عدم اور بقا میری ہی جانب سے بطور سیمپل

بالکل مفت تقسیم کر رہی ہوں، ایک شورِ نشور برپا ہے۔ جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے، گویا فساد ہو گیا ہو، احتجاجی مراسلے بھیجے جا رہے ہیں کہ مجھے روکا جائے کیونکہ میں آشوبِ چشمی سے مجمعِ عشاق پر لاٹھی چارج کر رہی ہوں، اشک آور گیس استعمال کر رہی ہوں، نقضِ امن کا سخت خطرہ ہے اس لئے کوششیں ہو رہی ہیں کہ میری حرکات و سکنات پر کرفیو آرڈر لگوا دیا جائے۔

ان کو باقاعدہ خطاب دیئے جاتے ہیں۔ نظریں لگائی جاتی ہیں۔ چشمِ فتاں، چشمِ غزالاں، نرگسِ بیمار، ساحرِ مست، موئی آنکھیں نہ ہوئیں، تماشا ہو گئیں۔ اور صاحب ان کی تعریف، اللہ تیری پناہ! ایک بزرگوار فرماتے ہیں۔

مارا ہوں چشمِ مست کا میرے سوم میں ہوں
نرگس کے پھول اور پیالہ شراب کا

اگر میں زمین کی جانب دیکھ بھی لوں تو یہ فوراً شور مچانا شروع کر دیں گے۔ "دیکھو دیکھو نگاہِ ناز جھکی ہوئی ہے" اگر ان کی طرف دیکھ لوں تو ان کا دم ہی نکل جائے، اگر میں کنکھیوں سے بھی کسی کی جانب دیکھ لوں تو یہ شور مچانا شروع کر دیں گے 'اہاہا ہمارے دل کی کلی کھل رہی ہے' میں نے ان کی جانب دیکھا نہیں بلکہ ان کنکھیوں سے شراب پلا دی۔ میری آنکھوں میں لگے ہوئے سرمے کو صرف کالا کہنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس میں باقاعدہ اسکیٹنگ کی جاتی ہے۔ پھٹا پھٹ گرتے ہیں۔ جس کے سبب فوراً ان کے دلوں میں فریکچر ہو جاتے ہیں۔ مگر بیشتر کے قدم تو میرے تصور ہی میں ڈگمگانے لگتے ہیں، اگر مجھے ان کے بدنام کرنے اور خواہ مخواہ میں رسوائی کے ڈر سے رونا آ جائے تو یہ شور مچانے لگیں گے کہ ہم نے شعلوں پہ مچلتی ہوئی شبنم دیکھی۔

ذرا میرے تاڑ سے لمبے قد کو تصور میں لائیے تاکہ قطب مینار کی بلندی بیک گراؤنڈ میں چلی جائے۔ سر کی ٹوپی قدموں پہ آ رہی ہے۔ سرو تاڑ اور شمشاد شرما جائیں۔

میری نزاکت کا یہ عالم ہے کہ فرشِ مخمل پہ میرے پاؤں چھلے جاتے ہیں۔ چھوئی موئی کی طرح دُہری ہوئی جا رہی ہوں، مگر میری چال جادو جگا رہی ہے، فتنے بیدار کر رہی ہے۔ قیامت ڈھا رہی ہے۔ میری آواز پر زلزلے، طوفان اور بھونچال چلے آ رہے ہیں۔ عاشق کی سماعت زائل ہوئی جا رہی ہے۔ مگر قمریاں ان شیریں نغموں کو سن کر اپنی قسمت کو کوس رہی ہیں۔ فضاؤں میں ارتعاش ہے پھول کھل رہے ہیں۔ کلیاں مسکرا رہی ہیں۔ غنچے منہ چڑا رہے ہیں۔ جھوم رہے ہیں جھک رہے ہیں۔ بہار یلغار کر رہی ہے، کوئی قدموں پر لوٹ رہا ہے کوئی دل تھامے اپنی باری کا منتظر آیۃ الکرسی پڑھ رہا ہے گلچیں قدموں پر پھول بکھیر رہا ہے۔

ابرو، بھالے اور نیزے بن کر جگر کے پار ہوئے جا رہے ہیں۔ پلکیں تیر نیم کش سر کر رہی ہیں۔ دانت مثل چاندنی کے پھولوں کے کھلے ہوئے سپیدۂ سحری کو منہ چڑا رہے ہیں، میں نے پان نہیں کھایا ہے بلکہ لعل پر آب دیدی ہے۔ لب شفق کی سرخی بکھیر رہے ہیں قوس قزح پر تبسّم کی کی بجلیاں چمک رہی ہیں، رخسار پر خالِ حُسن نہیں بلکہ سنگِ اسود ہے جس کے طواف کرنے والے کو یکمشت کئی حج کا ثواب، ایڈوانس مل جاتا ہے۔ گردن بلّور کی صراحی اور انگلیاں ماہِ نو کا نقشہ پیش کر رہی ہیں۔ پیشانی ماہِ تمام میں مثل کندن کے چمک رہی ہے۔ سینہ نہیں الماس کا پھول ہے۔ میرے ہاتھوں میں مہندی نہیں بلکہ عشاق کے دلوں کا خون رچا ہوا ہے۔ میرے پاؤں میں کڑے نہیں بلکہ ان کے سخت دل جڑے ہوئے ہیں۔ میرے دہن کی تنگی نقطۂ موہوم کو مات دے چکی ہے اور کمر کی باریکی نکتۂ خیالی کو شہہ دے رہی ہے۔ میری مسکراہٹ کے کوندے لپک رہے ہیں۔ برق ان کے آشیانوں سے چشمک کر رہی ہے جس کی وجہ سے ان کے آشیانے دھڑا دھڑ جل رہے ہیں۔ مختلف فائر بریگیڈ آگ بجھانے میں یک لخت مصروف ہیں۔ دلوں کے کباب تیزی سے تیار ہو رہے ہیں۔ [illegible] قیامت کے قائل ہو رہے ہیں۔ ایمان لا رہے ہیں۔

جس طرف سے مسکرا کر گذر جاتی ہوں بہ چشم زدن میں علاقے کا علاقہ ریڈیو ایکٹیو ہو جاتا ہے۔ مگر میں ان سب فضولیات سے قطعی آؤٹ آف ٹچ ہوں۔ نہ میری دیکھ بھال ہے نہ داد فریاد۔ نہ نقل و حرکت پر پابندی۔ جدھر نکل جاتی ہوں عشاق پر کرفیو نافذ کر دیا جاتا ہے۔ میرے جلال کا یہ عالم ہے کہ بقول عشاق، اگر میدانِ جنگ میں صرف مجھے ایک بار بے نقاب گذار دیا جائے تو طرفین بے ہوش ہو جائیں۔ میدان کا میدان صاف ہو جائے صلح کی جھنڈی بلند کر دی جائے۔ مگر تجربے سے پہلے بہتر ہے کہ ٹرمس معلوم کرنے کے لئے ان صاحبان سے ٹنڈر طلب کر لئے جائیں۔

میری بل کھائی ہوئی چال کے آگے تیز طرار، شوخ و شنگ، پہاڑی اور طوفانی دریاؤں کی گڈرل بھی سخت خطرے میں ہے۔ بگولے فیڈ آؤٹ ہوئے جا رہے ہیں، جدھر سے نکل جاؤں معلوم ہو سارے علاقے پر بمباری کی جا چکی ہے۔ کشت و خون کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔ عاشق جگر تھام کر دھڑا دھڑ گر رہے ہیں پہاڑوں کو زلزلے آ رہے ہیں۔ شاعر اپنی پہلی فرصت میں کسی خیراتی ہسپتال میں داخلے کے سلسلے میں رفو چکر ہو چکے ہیں۔ مگر نہ میرے کان پر جوں رینگتی ہے اور نہ میں اس سلسلے میں سانس لیتی نظر آتی ہوں۔ نہ ڈکار بلکہ تن من دھن سے اپنے اس مشن میں مصروف ہوں۔

میری آواز کی تمام خوبیاں اگر جمع کر کے ریکارڈ کر لی جائیں اور یہ ریکارڈ اگر کسی بچے کو سنوا دیا جائے۔ تو وہ ضرور ڈر جائے گا۔ ملاحظہ کیجئے:۔

میرا سر پُر غرور نخوت سے بلند ہے میرے مسکرانے اور گنگنانے سے زلزلے آ رہے ہیں۔ بچے ماؤں کے سینے سے چمٹے جا رہے ہیں۔ بہاروں کو حال آ رہے ہیں۔ آبشار وجد میں ہیں پھر اس میں وہ گہرائیاں تلاش کی جاتی ہیں جو تان سین کو خواب میں بھی نہ سوجھی ہوں گی

ورنہ ضرور فساد ہو جاتا۔

میرے جملہ اعضائے رئیسہ قتل و غارت میں مصروف ہیں۔ میرا ٹائم ٹیبل بلا میک اپ کرنے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔

جتنا آرائش کا سامان یہ میرے یہاں پاتے ہیں افسوس کہ اتنا کوڑا کباڑا آپ کو کسی کباڑی کے یہاں بھی نہ ملے گا۔

یعنی میری پشت پر ترکش دوش پر کمان ہاتھ میں انٹرٹینمنٹ کے لئے ننگی تلوار جیب میں بھری ہوئی پستول، اصلی ہرن مارکہ دوسری جیب میں لائسنس اور قتل دو عالم کے لئے عام معافی نامہ۔ قتل کا بازار گرم ہے دروازے پر صدہا خون کی ندیاں زناٹے کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ عشاق کا بُرا حال ہے۔ کوئی سر پھوڑ رہا ہے کوئی دم توڑ رہا ہے۔ مگر حیا میرا دامن پکڑے ہوئے ہے۔ انگیجمنٹ اس قدر زیادہ ہیں کہ فی الحال معمولی مقامی واقعات پر فوری توجہ نہیں دی جاسکتی، ورنہ کلب کا پروگرام مس ہو جائے گا۔ میں اپنے کزنوں (رقیبوں) کے جھرمٹ میں چمن کی سیر کر رہی ہوں۔ بوٹنگ کر رہی ہوں۔ کافی ہاؤس میں ٹیبل ٹاک کر رہی ہوں۔ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں مگر اس کے باوجود عشاق کے دل نازک امیتش ہو جانے کے اپنی سمع خراشی سے ڈسٹرب کرنے میں مصروف ہیں۔ اور تو اور مجھے بدنام کرنے کے لئے چڑیمار مشہور کر دیا گیا ہے۔ دشمنوں کا خیال ہے کہ میں باقاعدہ جال لگا کر عاشقوں کو پھانستی ہوں۔ تیر مار کر گراتی ہوں، یا فوراً شوٹ کر دیتی ہوں۔ کبھی جرمانہ لے کر چھوڑ دیتی ہوں یا محض وارننگ دے کر پولیس کے حوالے کر دیتی ہوں۔ اگر موڈ آیا تو شکار کھیلنے جنگل کی جانب نکل گئی۔ خبر پاتے ہی جنگل کے سارے چڑیمار اپنی پہلی فرصت میں آکر مفت پانی بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جنگل کے پنچھی اور پکھیرو کباب ہو جانے کی خاطر رضا کارانہ طور پر اپنے کو پیش کرنا شروع کر دیتے

ہیں مگر اس موقع پر چکور کو آپریٹ نہیں کرتا اور چاند کی جانب اپنی اڑان میں بزی رہتا ہے۔ عاشق اصرار کرتا ہے کہ پہلے ہمارے دلوں کے کباب بنائے جائیں۔ ورنہ ہم ان جانوروں کے خلاف پرداشت کریں گے۔' بقیہ صیاد کہیں اور سے آکر میرے آگے کان پکڑتے ہیں' قدموں کی خاک منہ پر ملتے اور جوتے پر پالش کرتے ہیں۔ کان چھوڑنے سے پہلے توبہ کرلیتے ہیں اور اپنی فریاد پکے راگوں کی صورت میں پیش کرتے ہیں' موسیقی کے اس ہلکے پھلکے پروگرام کے بعد بوریت ہونا شروع ہوجاتی ہے اور مجبوراً ان کو بھی پرندوں کے ساتھ پنجروں میں پیک کر کے صحن چمن میں لٹکوا دیتی ہوں' جہاں یہ فوراً جملہ پرندوں کے ساتھ میری سلامتی کے گیت سُر سے سُر ملا کر گانا شروع کر دیتے ہیں۔

پھر یہ مجھے تنگ کرنے والے بھی تو ہر قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ یعنی ایک تو وہ 'ڈیڈی' قسم کے بڑے میاں ہوتے ہیں جو گھر کے شیر اور بازار کے بھیڑ ہوتے ہیں۔ ان کی بیویوں کا انتقال اس کثرت سے ٹی بی میں ہوتا ہے کہ ان کے ہاتھ کی شادی کی لکیروں کا اسٹاک ختم ہوچکا ہوتا ہے۔ یہ اپنی گھر والیوں سے چھپ کر آتے ہیں۔ اگر ان کی گھر والیوں کو پتہ چل جائے کہ مصرعہ طرح [illegible] ے اوپر کیا کیا ظلم ڈھائے جارہے ہیں تو وہ ان کے اوپر قیامت، ڈھادیں اور ان کی موت کی آرزو اُسی وقت پوری کردی جائے۔

ایک جنگجو قسم بھی ہے جو رزم چھوڑ کر بزم میں آنا چاہتے ہیں ان مرزا جنگی قسم کے عاشقوں سے خدا دشمن کی موت کو بھی بچائے۔ یہ مجھے گھر سے نکال کر میدانِ جنگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔ مجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ ہمارے دو بدو آکر تلوار چلاؤ، فرسٹ ایڈ باکس لے کر نامحرموں کی مرہم پٹی کرو۔ اپنے آنچل کا پرچم بنالو۔ ٹینک میں بیٹھ کر گولہ باری کرو۔ مباری کرو۔ ان کا بس چل جائے تو یہ مجھے بلا رسوا کئے اور ہتھکڑیاں لگوائے دم نہ لیں۔

اور یہ ناصح قسم کے اُمیدوار برابر مجھے اپنے خفیہ خطوط میں لکھتے رہتے ہیں عبادت کرو، اس دنیا کو سرائے فانی سمجھو۔ ہم جلد تمہارے توسط سے محبوبِ حقیقی تک پہنچنے کے لئے تمہارے پاس آنے والے ہیں ورنہ ہماری بخشش نہ ہوگی۔ اسی بہانے یہ میرے گرد مٹی کاٹتے رہتے ہیں مگر بظاہر یہ ہمیشہ میرے خلاف زہر اُگلتے اور اکساتے رہتے ہیں۔ غالباً یہ ایسا رقیبوں کی تعداد کم کرنے کی خاطر کرتے ہیں۔

ان نوخیز کالج کے چھوکروں کے بارے میں کیا عرض کیا جائے۔ جن کے لباس پر اگر ایک اُڑتی ہوئی نگاہ بھی پڑ جائے تو پھر اُس دن اخبار پڑھنے کی چنداں ضرورت باقی نہ رہ جائے۔ یہ میری یاد میں فلمی گیت گاتے اور رمبا سمبا کرتے رہتے ہیں مگر شکر ہے کہ ان سے جلد نجات مل جاتی ہے۔ کیونکہ یہ فلمی ہیرو بننے کے چکر میں بہت جلد بمبئی بھاگ جاتے ہیں جہاں سب اِن کے بے چینی سے منتظر ہوتے ہیں۔

غرض صاحب کیا کیا عرض کیا جائے، مفت میں گھر بیٹھے اتنی بدنامیاں ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان سب کے چلتے انجام کیا ہوگا اور خود میرا کیا حشر ہوگا۔

محبوب آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے دریافت کیا۔ "کیا آپ کو اور کوئی سوال کرنا ہے ورنہ میں چلوں۔ مجھے امتحان کی تیاری کرنا ہے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔"

"جی ہاں مجھے خود بھی خیال ہے، میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا بس ایک آدھ بات، اور۔"

"پوچھئے۔۔!"

"آخر آپ اِن عاشقوں سے اس قدر نالاں کیوں ہیں، جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس کے مطابق تو یہ ہمدردی کے مستحق زیادہ سمجھے جا سکتے ہیں کیوں نہ ان کا نفسیاتی علاج کیا جائے یہ عاشق سے زیادہ تو بیمار معلوم ہوتے ہیں۔"

"آپ نے "عاشق" کا لفظ استعمال کر کے سوال کو بالکل 'امتحان والا سوال' بنا دیا ہے۔ میری مراد روایتی عاشقوں سے ہے جن کا مرض لاعلاج ہے۔ مجھے علم بھی نہیں ہو پاتا اور یہ اپنا کام تمام کر لیتے ہیں مجھے تو یہ جاپانیوں کی 'ہیرا کیری' تحریک سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مسخرے بری طرح ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مفت میں مجھے رسوائے زمانہ کر دیا ہے۔ سچ پوچھئے تو بیشتر کے گھر میں کھانے کو بھی نہ نکلے گا۔ مگر اپنی پہلی فرصت میں آسمان سے تارے توڑ لانے کا اعلان کر دیں گے۔ پھر اس کو گنیں گے بھی۔ اس ہابی کا نام انھوں نے 'اختر شماری' رکھا ہے۔ یہ ارمانوں کی دنیا اس تیزی سے اُجاڑنے اور بسانے کا کام انجام دیتے ہیں کہ چاہیں تو آبادکاری کے ماہر کا بورڈ اپنے یہاں لگوالیں اور گھر بیٹھے کمائیں مگر عاشق جو ٹھہرے۔

عموماً یہ علی الصباح بک بک منانے کے لئے گریبان پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے شبہ ہے یہ اس بہانے کسی ہوٹل میں اُدھار چائے پی کر اخبار پڑھتے اور مجھے خط لکھتے ہیں۔ اور جواب نہ ملنے پر بے تحاشہ مجھے کوسنا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا پھر تسلی کے لئے خود ہی اُس کا جواب بھی لکھ کر عام نمائش کے لئے اپنی اوپری جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے اِن کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ یہ صبح صبح نہار منہ چمچہ بھر غم ناشتے میں خونِ جگر کی تراوٹ کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کے سبب ہر وقت ان کا دم لبوں پر اور جان آنکھوں میں اٹکی رہتی ہے۔ ان کو وقت برباد کرنے کے تمام حربے زبانی یاد ہوتے ہیں نہ جانے کس وقت پڑھتے لکھتے یا دفتر میں کام کرتے ہوں گے۔ ہر وقت تو میرے سنگِ آستاں کو مجروح کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ماورائی عشق میں مجھ سے اُفق کے پار، یا گیتوں کے سنہری جزیروں میں ملنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ ان کے دل کو چھینا واپس کیا، کھویا، پایا اور رہن رکھا جا سکتا ہے۔ نقاہت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ صبح صبح جمعدار جھاڑو میں خس و خاشاک

کے ساتھ ان کو گھورے پر چھوڑ آتا ہے جہاں لوگوں کو آپ اپڑے ملتے ہیں۔ دن ہارٹ فیل کے ریہرسل میں گذر جاتا ہے۔ یوں تو جوان جہان، پورے ڈھور کے ڈھو۔ وزن بھی اتنا زیادہ کہ وزن کم کرنے والی مشین ان کے بوجھ سے ٹوٹ جائے۔ مگر لاغری کے سبب ان کو موت تک نظر نہیں آتی۔ بلکہ دھوکے میں کسی "نان عاشق" کو لے جاتی ہے جس کے اوپر خود بخود چراغ مفلسی ٹمٹمانے لگتا ہے ویرانی جھاڑو دینے اور وحشت پہرا دینے کے لئے اچانک حاضر ہو جاتی ہے۔ عاشق صاحب قبر میں کروٹیں بدلتے اور حالات کی اسٹڈی کرتے رہتے ہیں۔ منتظر رہتے ہیں کہ میں ماتمی لباس میں مجاوری کرنے کے لئے روتی پیٹتی اپنی خطائیں معاف کروانے کے لئے پہنچوں مگر جلد خود ہی بور ہو کر قبر سے نکل بھاگتے ہیں۔ شبِ فراق سے بلیک میلنگ کرنے کے لئے وصل کی تمنا میں شبِ قدر کا انتظار کرتے ہیں اور اسی بہانے اپنے آپ کو اختر شماری سے صاف بچا لیتے ہیں۔ ضد اس بات پر کرتے ہیں کہ ہماری آنکھوں میں سما جاؤ ورنہ ہم خودکشی کر لیں گے۔ اکثر دھمکی دینے کے لئے میری چوکھٹ پر بھی ہڑتال، ستیہ گرہ اور قانون شکنی بھی شروع کر دیتے ہیں۔ خواہ ان کو جھوٹوں منہ نہ لگاؤں، تب بھی یہ شب کی مجلس میں گھس آئیں اور جوتیوں کے پاس اس انتظار میں بیٹھیں گے کہ اب نکالے جائیں اور تب۔ ان عاشقوں کی ٹیم صرف میری خاطر دنیا بھر کی الّاؤں بلاؤں سے ٹورنامنٹ کھیلتی رہتی ہے۔ ان کا ہر کھلاڑی دور ہی سے 'شنکرز کارٹون معلوم ہوتا ہے۔ ان کو لاکھ اشارے کرو، سمجھاؤ، کھانسو، کھنکارو، نظر انداز کرو، لوگوں سے کہلواؤ، مگر ان کی خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ لے دے کے ایک عشق اور وفاداری کے دھمکی زدہ سرٹیفکیٹ کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نظر نہیں آتا، کیا عجب کہ یہ بھی نقلی ہو۔ آئے دن میری یاد میں تنکے چُنے جاتے ہیں۔ پھر یہی تنکے خارِ فراق بن کر ان کے جگر میں کھٹکتے ہیں جگر بلا آرڈر لئے مستقل کباب، شاہی کباب، سیخ کباب، نرگسی کباب، گولے کے کباب، ٹکیہ کے کباب،

بوٹی کے کباب، کوفتے اور کبابہ تیار کرتا رہتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے یہ کبابی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دکانِ حسن عاشقوں کے اُدھار کے سبب جلد ہی بند ہو جاتی ہے۔ پھر شبِ فراق کی پیمائش جس سے فی الحال ریاضی بھی معذور ہے (ریسرچ کے لئے "آئیڈیا" برا نہیں) میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اگر میں اِن کو نظر آجاؤں تو افواہ ہے کہ شبِ ہجراں سمٹ کر اِن کی آنکھوں کا تِل ہو جائے۔ یہ باتیں بڑی لمبی چوڑی کرتے ہیں مگر مجھے دیکھتے ہی یہ نہ جانے کیوں اتنے نروس ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت بات کرتے اِن کی زبان کٹتی ہے۔ اسی لئے چاند تارے کاٹنے کے بہانے مجھے کاٹ کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِن کی برادری کے ایک ممبر مسٹر ممبراں کا آپ نے نام سُنا ہوگا۔ ایک بار انہوں نے میری یاد میں بیٹھے بٹھائے اتنی بڑی مقدار میں آنسو بہا دیئے کہ ندی نالے سب جل تھل ہو گئے، کھیتیاں لہلہا اُٹھیں، چرند پرند سیراب ہو گئے۔ یہاں تک کہ باڑھ آگئی۔ خود حضرت بڑی مشکل سے ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ اُن کے گھر والوں نے اُن کو وارننگ دی کہ "آئندہ بلا باندھ بنائے آپ نہیں روئیں گے ورنہ ہم ہرگز آپ کو ڈوبنے سے نہیں بچائیں گے"۔ اس افواہ پر کیسے یقین کر لیا جائے اگر ایسا ہوا ہوتا تو ضرور ان کے اوپر واٹر ٹیکس عائد کر دیا جاتا۔ اور ریگستان کو با آسانی نخلستان میں تبدیل کر لیا جاتا۔

اور تو اور یہ اپنا علاج بڑا دلچسپ بتاتے ہیں کہ "ہم ان ہومیوپیتھک کی گولیوں سے اچھے ہونے والے نہیں ہمارا علاج تو یہ ہے کہ پبلک ہم کو ڈھیلے مار کر ہلکا پھلکا سنگسار کر دے، یا پھر ہمارا سر آہستہ سے دیوار سے ٹکرا دے"۔

محبوب بولتے بولتے خاموش ہو گیا، کچھ بیزاری کے آثار نمایاں ہونے لگے، میں نے اُس کو نارمل کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کا گلاس آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"اچھا اِن شاعروں کا کیا قصور ہے۔ کچھ نہیں تو اِن کی خطا اب معاف کر دی جائے۔"

"شاعروں کو بھلا ۔ میں ۔ اور معاف کر دوں ۔ ناممکن، سوپ بولے تو بولے چھلنی کیا بولے جس میں نوسو بہتر چھید۔ عاشقوں کو تو خیر ایک حد تک برداشت بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر اِن شاعروں کو آخر کس خانے میں رکھا جائے گا۔ میں تو ان سے اس قدر خفا ہوں کہ اگر میرا بس چل جائے تو میں ان سب کی جبری بھرتی کروا کے کھڑے کھڑے لام پر بھجوا دوں اور حکم دے دوں کہ اِن سے اس قدر "ذلیل" کی جائے کہ اِن کو دن میں تارے نظر آنے لگیں۔

ان کو آپ کسی سے کم سمجھتے ہیں میں تو ان سے اتنی ناراض ہوں کہ اِن کے اشعار تک سننے سے قبل ہی کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ خود شعر پڑھنا تو بڑی بات ہوئی۔ وہ تو کہیئے مجھے اشعار یاد نہیں رہتے، ورنہ اب تک مجھے کب کی ٹی بی ہو چکی ہوتی۔ انہوں نے میرے ساتھ ایکٹی ویٹی یہ کی ہے کہ لیلیٰ عذرا، وغیرہ صدہا فرضی ناموں کو میری جانب منسوب کر کے میری فرضی جدائی کا ماتم شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہوتا ہے۔ یہ عشق کی آگ سے پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوتے ہی جلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا عشق، عشق پیچاں کی طرح پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ فوراً ہی اس کی وسعتوں میں حیات و کائنات کو سمیٹ لیتے ہیں۔

شاعر محبوب کے انتخاب کے لئے الیکشن لڑانے کی کوشش کرتا ہے ضمانت ضبط ہو جانے پر ملکِ عدم کی چڑھائی طے کرنا شروع کر دیتا ہے۔ موقع ملتے ہی زلفوں میں چھپ جاتا ہے ان کے پیچ و خم میں بھٹکتا ہے اگر اسمگلنگ کر کے زلفوں کا جال حاصل ہو گیا تو شکار کھیلنے نکل جاتا ہے۔ اور مچھلی کے شکار کے بہانے بزنس شروع کر دیتا ہے۔

ڈرتا ہے کہ میں خواب میں بھی نہ اُس کے پاس چلی جاؤں ورنہ جانتا ہے کہ پھر گھنٹوں مفت میں پاؤں دابنا پڑیں گے۔ اپنی موت کی بشارت برابر اپنے کلامِ بے لگام سے دیتا رہتا ہے۔

ہنگامی حالات کا اعلان ہوتا رہتا ہے۔ عشق کے لئے کوئی شرط نہیں ادھر کال آئی اور اُس کا دل شتر بے مہار کی طرح پھسل پڑا۔ اس گپ پر کون یقین کرے گا کہ بنا بیتی عاشق صاحب کی گردن پر میں نے سرِ شام ہی سے ایکسٹمپور خنجر چلانا شروع کر دیا۔ گردن نہ کٹنا تھی نہ کٹی شام ہوتے ہوتے خنجر سے صلح صلح اور بس بس کے نعرے بلند ہونے لگے۔ عاشق سخت جان کی جانب سے پیش کش کی گئی کہ اگر مجھے قتل فرمایا جائے تو سات پشتیں احسان مانیں گی۔ ورنہ ہم خنجر سے حشر تک چمٹے رہیں گے۔

اپنے اندر خامیاں اس قدر گنواتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی مخبری کر دے تو ان کو ہسٹری شیٹر قرار دے کر نگرانی شروع کر دی جائے یا علاقہ بدر کر دیا جائے۔ میخانے الاٹ کرائے پڑے رہتے ہیں کہ:

نہ آنا پڑے گا نہ جانا پڑے گا

مر کے نکلنے اور بائیں ہاتھ سے جی اُٹھنے کے حوصلے ہیں۔ روزانہ میری محفل میں بنچ پر کھڑے کر دیئے جاتے ہیں مرغا بنا دیئے جاتے ہیں، بے آبروئی کی ترشی سے ان کا نشہ ہرن کرا دیا جاتا ہے مگر یہ باز نہیں آتے۔ غزل لکھنے کے لئے البتہ چلے جاتے ہیں مگر غزل لکھ کر واپس چلے آتے ہیں اور میری جان پر ستم توڑتے ہیں۔

محبوب خاموش ہوگیا، اُس نے اپنی گھڑی دیکھی میں اُس کے تیور بھانپ گیا اور بولا۔

"مجھے آپ کی عجلت کا احساس ہے بس ایک بات اور پوچھنی تھی۔"

"پوچھیے۔!"

"یہ رقیب، دربان، اور چرخ وغیرہ کے بارے میں کیا سننے میں آتا ہے۔ اگر یہ"

"بس بس میں سمجھ گئی آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ یہ سب شوشے اُن ہی سب کے چھوڑے

ہوئے ہیں۔ جس سے میں ذرا بھی بات کرلوں یا لفٹ دے دوں یا کزن بنالوں اُس کو یہ رشک و حسد کے شکار رقیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ رقیب اس لئے بُرا ہے کہ وہ ان کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ اور تو اور بقول اِن کے میرے دروازے پر تختی لگی رہتی ہے۔ "خبردار بلا اجازت اندر آنا منع ہے۔" اگر آپ رقیب نہیں ہیں۔ رقیب کے بغیر عشق کا تصور ادھورا، گویا سب اسی کے دَم کا ظہور ہے۔ میں باقاعدہ اس سے محفل کی صدارت کرواتی ہوں اور خاطر مدارات کرتی ہوں۔ یہ جوتیوں کے پاس آکر بیٹھتے ہیں مگر اکیٹی ویٹی سے یہاں بھی نہیں چوکتے، بلکہ موقع پاتے ہی رقیب کی جوتیاں انتقاماً پار کردیتے ہیں۔ جوتی چرانے کی رسم بُری نہیں۔ مگر اس کا بھی ایک موقع ہوتا ہے۔

دربان سے یہ کیوں خوش ہونے لگے اُس کے تصوّر ہی سے ان کو ہَول ہونے لگتی ہے۔ دروازے سے اِن کی ٹانگ لیتا ہے، دھوبی کا پاٹا دیتا ہے، پولیس کے حوالے کو دیتا ہے۔ اس کے اختیارات کسی بھی طرح حاکم جیل سے کم نہیں ہوتے۔ یہ سیاست اور جوڑ توڑ کا ماہر ہر وقت چوکنا رہتا ہے عاشق کو دور سے آتا دیکھ کر 'ہو کمس دیر ہالٹ' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ تلاشی لیتا ہے کہ آپ کہیں میک اَپ کئے ہوئے تو نہیں ہیں۔ رقیب کے بھیس میں کہیں کوئی عاشق تو نہیں ورنہ گردن میں ہاتھ ڈال کے نکال باہر کرتا ہے۔ کہ۔ بلا بی اے پاس کئے ادھر آپ کیسے آگئے۔ یا۔ یہاں صرف پڑھے لکھے اور بارروزگار حضرات آنے کی جرأت کریں۔ ادھر دربان نے ان کی گردن ناپی اور جھٹ انہوں نے اپنی گردن پیش کردی، اور اصرار شروع کردیا، ہم سے اسٹامپ لکھوالیا جائے۔ ہم آپ سے خوں بہا تک نہ لیں گے۔

مایوسی کی صورت میں چرخ ناہنجار کو ان تمام جفاؤں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ سب کچھ اسی کے ایماء سے ہوتا ہے۔ یہی ہمارے آشیانوں پر بجلیاں گراتا ہے، قفس کی تیلیوں سے خلال

کر ڈالتا ہے۔ زندہ غائب کر دیتا ہے۔ بہت بڑا بہروپیا ہے اُس کی ہر چال ترپ چال ہوتی ہے۔ اُسی کے اشارے سے شبِ فرقت عدم کی طوالت سے جا ملتی ہے۔ قیامت اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر حاوی ہوتا ہے۔ آہ سے دھواں نہیں نکلتا، دعا قبول نہیں ہوتی، اس کی ہر گھڑی پہاڑ اور پوری رات پہاڑہ ہوتی ہے۔ اس کا مصرف ہاؤ ہُو کرنے اور تارے گننے کے لئے نہایت مفید ہوتی ہے۔ اِن ہنگامی حالات کو ختم کرنے کے لئے عاشق مرغا بن کر اذان دیتا ہے۔

اِنہوں نے ایک چیز اور دریافت کی ہے اس کو ان کی اصطلاح میں موسم بہار کہتے ہیں۔ یہ سال بھر اِن کی جان پر مُسلط رہتا ہے۔ نہ جانے کب شروع اور کب ختم ہو جاتا ہے۔ دیوانوں کی نو آبادیاں کثرت سے قائم ہو جاتی ہیں، جنگل میں منگل ہوتا رہتا ہے، نسیم زلفوں میں اُلجھی فریاد کرتی رہتی ہے۔ قمریوں، کوئلوں اور بلبلوں کی ٹریڈ یونین ماتم و سینہ کوبی میں مصروف رہتی ہیں۔ فضاؤں میں ارتعاش، ہواؤں میں وجد، کلیاں چٹک رہی ہیں، غنچے مہک رہے ہیں......"

محبوب ابھی کچھ اور کہنے والا تھا۔ مگر کہتے کہتے رُک گیا۔ میں بھی اس کی فریاد سنتے سنتے کچھ شرمندہ سا تھا۔ اور فرش پر آنکھیں گاڑے اس پر کان لگائے ہوئے تھا۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لئے میں نے جیسے ہی نگاہ اُٹھائی تو محبوب غائب تھا۔ میرے ہاتھ میں خواجہ الطاف حسین حالیؔ کا "مقدمہ شعر و شاعری" تھا۔ جسے میں بہت دیر سے پڑھ رہا تھا۔ دراصل پڑھتے پڑھتے میری آنکھ لگ گئی تھی۔

گلّی ڈنڈے پر سمینار

سچ پوچھئے تو یہ "کلجگ" ... نہیں "سمینار یگ" ہے۔ اگر ہم اس میں جی رہے ہیں
تو صرف اس لئے کہ کسی نہ کسی سمینار میں یہ طے کیا جا چکا ہے کہ "ابھی ہمیں جینے دیا جائے"
اگر ہم کھا پی رہے ہیں تو اس بنیاد پر کہ کوئی اہم سمینار یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ "نسل انسانی کی بقا
اس کے کھانے پینے رہنے میں ہے۔" اگر ہم سانس لے رہے ہیں تو صرف اُس عالمی سمینار کے
صدقے جس میں بڑی طاقتوں نے یہ قرارداد منظور کر لی تھی کہ "چونکہ انسانی زندگی میں تسلسل
کا ایک پہلو سانس لینے کا عمل بھی ہے اس لئے کوئی ایسا نیوکلیائی بم فی الحال ایک دوسرے
پر نہ داغیں جو فضا کی ساری آکسیجن سوخت کرلے اور انسانی سانس نظام متاثر ہو کر اس
تسلسل کو ختم کر دے جس سے بم داغنے والے بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ جن کی زندگی میں تسلسل
امن عالم کے لئے ناگزیر ہے۔"

ہم کوئی کاروبار یا روزگار صرف اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ اس کے حق میں متعدد
سمینار ہو چکے ہیں۔ اگرچہ وہ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکے اور اب بھی مسئلہ زیرِ غور ہے کہ
"آخر گائے بھینسیں کون سا کاروبار کرتی ہیں جب کہ وہ بھی حضرتِ انسان کی طرح چوپایہ

ہیں۔ لیکن فکرِ معاش سے آزاد، ہشاش بشاش، زندہ اور سلامت ہیں۔ اُلّو اور کوّے کون سا کاروبار یا روزگار کرتے ہیں۔ جبکہ وہ انسان سے زیادہ آرام سے ہیں۔ آدمی سے زیادہ فکر اور عقل رکھتے ہیں۔ پھر فضیلت یہ کہ بشر نہ ہوتے ہوئے بھی اڑ سکتے ہیں۔ جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی خود سے اڑ تک نہیں پاتا۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے اگر انسانی روزگار، کاروبار اور صنعت و حرفت، جیسے دھندوں کا حق طلب کر لیا گیا تو حکومتیں روزگار دلانے، دھندے کرانے، بے روزگاروں کے طعنوں اور معاشی بحران سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گی۔ اور دنیا میں کامیاب حکومتوں کا دور شروع ہو جائے گا۔

چند فرسودہ خیال حضرات کے مطابق "ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ زندگی کی طرح ادب بھی معنویت، ترسیل اور قاری کا محتاج ہے۔ نئے روشن خیال تو عرصہ ہوا ادب و زندگی یا لفظ و معنی کے فکری بستے نذرِ جزدان کر چکے ہیں۔ لیکن زندگی سے ادب میں سیمنار کی ایسی یلغار ہوئی کہ کیا فرسودہ، کیا روشن، بے عقل مکتبِ فکر تک کو سیمنار ہو گیا ہے۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم نے ایسے ایسے ادبی سیمناروں میں شرکت کی ہے جو آپ کے وہم و خیال میں نہ آسکیں۔ کیونکہ ہم پر ادیب ہونے کی تہمت ہے۔ اس لئے ہمیشہ وقتِ عزیز روپے اور کوفت، کی شکل میں شرکت کا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ :- "ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ!"

مثلاً علامہ اقبال بھی کوئی شاعر تھے؟" سیمنار ادبی انارکسٹوں نے کانکے یا آگرہ میں برپا کیا تھا۔ فاضل مقررین میں اکثریت نو مولود شعرا کی تھی۔ کوئی بھی شاعر تین تولے سے زیادہ فکر کا مالک نہ تھا۔ اس محفل کے سارے باشندے کو وہ اقبال کو سر پر اٹھانے کے لئے بار بار ناک بھوں کتے اور چک جاتے۔ علامہ اقبال کو سرے سے کسی نے پڑھا ہی نہ تھا۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد علامہ اقبال کا نام سنائی دیتا۔ پھر کامیاب شعرا کے نام گنائے جاتے۔ جو سب کے سب سمینار میں موجود تھے۔ نام رٹوانے کے باوجود ہم ان میں سے کسی کی بھی شناخت نہ کر سکے۔ ہم اوروں کو کیا کہیں۔ جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ دل ہی دل میں ان سمیناروں سے توبہ کی۔ مگر توبہ کیجئے جب ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت ملی تو راستے ہی سے کچھ ریسرچ اسکالر ہمیں ایک سمینار میں اغوا کر لے گئے۔

موضوعِ فوجداری تھا۔ "قاضی عبدالودود ایک دہشت پسند محقق" شرکا میں "قاضی صاحب" کے حامیوں اور مخالفوں کی تعداد تقریباً برابر تھی — ایک قاضی حامی نے مباحثہ شروع ہونے سے پہلے موضوع میں ترمیم چاہی کہ لفظ "دہشت پسند" کو "سخت گیر" سے بدل دیا جائے۔ ایک اور دوسرے حامی نے جو کہ ان کا بہت ہی حامی تھا "سخت گیر" کو "با اصول" میں تبدیل کئے جانے کے لئے علمی، ادبی روایات کے واسطے دئے — اس پر ایک مخالف نے آوازہ کسا۔ "اگر موضوع "قاضی عبدالودود اردو تحقیق کے ملک الموت" کر دیا جائے۔ تو اس میں سارے پہلو آجائیں گے"۔ اس فقرے نے بارود کو فلیتہ دکھانے کا کام انجام دیا تھا۔ قاضی حامیوں اور مخالفوں نے دلیلوں کے بجائے کرسیوں اور اسٹولوں کا آزادانہ استعمال کیا۔ میز کے نیچے ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر وحید قریشی اور دوسرے امن پسندوں کے ساتھ ہم دل ہی دل میں سمینار کے غیر جمہوری طرزِ عمل پر احتجاج کرتے اور اس وقت تک آیۃ الکرسی پڑھتے رہے جب تک کہ پولیس کی سیٹیاں اور اہلِ سمینار کے ہال سے بھرّا مار کر نکل جانے کی دل خوش کن آوازیں ختم نہ ہو گئیں۔

اس پر ہمیں وہ تاریخی سمینار یاد آگیا جس کا موضوع تھا۔ "اردو تنقید میں کلیم الدین احمد کا قتلِ عام"۔ اس سمینار میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمام مقتولین جمع کئے گئے تھے۔ سید احتشام حسین مرحوم

خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ جب بولنے کھڑے ہوئے تو انہیں اپنا قتل یاد آگیا۔ شدتِ غم سے وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اس لئے بھی نہ کچھ بول پائے کہ انہوں نے کبھی کسی کی مخالفت میں کچھ نہ کہا تھا۔ مگر جب مجنوں گورکھپوری کھڑے ہوئے تو ان کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ پہلے انہوں نے اپنے دفاع میں دو ہزار فارسی اشعار کرسی پر کھڑے ہو کر سنائے پھر پانچ ہزار اُردو اشعار منبر پر کھڑے ہو کر سنائے۔ منتظمین نے انھیں اس خوف سے بٹھا دیا کہ سمینار کہیں مشاعرے میں نہ تبدیل ہو جائے۔ علی عباس حسینی مرحوم کھڑے ہوئے مگر بید مجنوں کی طرح غصے سے لرز رہے تھے جو منہ میں آیا کہہ گذرے اور اتنا کہا کہ کوئی کچھ سمجھ نہ سکا۔ آل احمد سرور نے آگے مجمع کو سنبھالا اور۔ "ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی" پر اصرار کے ساتھ انھوں نے سمجھایا کہ "کلیم الدین احمد کے یہاں پسی ہوئی بجلیاں ہیں۔ جن سے وہ کوئی آئینہ تو نہ بنا سکے مگر آئینہ، آئینہ کر دیا۔ انھوں نے اردو تنقید کا قتل نام کیا بھی اور نہیں بھی کیا۔ ان کی سفاکی میں حسن ہے اور حسن میں سفاکی ہے۔" ابھی سرور اپنے تنقیدی میزان کے دونوں پلڑے برابر بھی نہ کر پائے تھے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی تن تنا کر کھڑے ہو گئے اور بولے "صاحبو! ان کو پہچان لیجئے! یہ سمینار کو نہ ضیائے کلیم سے ضربِ کلیم تک پہونچنے دیں گے نہ ضربِ کلیم سے ضیائے کلیم تک۔" ان کے اس رکابی ردیئے کی طرف سب سے پہلے میں نے اس اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میرا یہ مقالہ آج سے بیس سال پہلے رسالہ "نقوش" لاہور کے "کلیم الدین احمد نمبر" میں پہلے نمبر پر چھپا تھا۔ اس میں بڑے بڑے لکھنے والے تھے مگر اولیت کا شرف صرف مجھے ہی حاصل ہوا تھا۔ اور "نقوش" میں محمد طفیل صاحب نے میری بہت بڑی "غیر شرعی تصویر سے" میرا مضمون شروع کیا تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے صفحہ ۱۱ سے میرا مضمون بائیں طرف سے شروع

ہوا تھا۔ اس شاندار تصویر کے نیچے "دگر دانائے راز آید" بڑے موٹے موٹے حروف میں چمک رہا تھا۔ کسی نے چلا کر پوچھا۔ "آخر آپ کلیم صاحب کی حمایت میں بولنا چاہتے ہیں۔ یا اپنی........؟" ڈاکٹر عبدالمغنی نے کہا۔ "افسوس کہنا تو بہت کچھ چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے پیش نظر میں چاہوں گا کہ محمد حسن عسکری صاحب تشریف لائیں۔

عسکری مرحوم تشریف تو لے آئے مگر دلہنوں سے کچھ زیادہ ہی شرمارہے تھے انہوں نے فرانسیسی میں کچھ کہنا چاہا۔ مگر ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ غش کھا کر گرے تو منتظمین انھیں لاد کر لے گئے۔ مجمع فیصلہ نہ کرسکا کہ یہ کیفیت شدتِ غم سے تعلق رکھتی ہے یا انتہائے شرم سے۔ غرض احتجاجی سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ شکر ہے کہ نظم و ضبط آخر تک برقرار رہا۔

اگر ادب سے زندگی کی جانب واپس جائیے تو معلوم ہوگا کہ آپ کے ہر طرف سیمینار ہورہے ہیں کہیں مقامی "انجمن تجہیز و تکفین کا سیمینار "مردوں کے مسائل" پر ہورہا ہے تو کہیں "مچھلیوں کی جنسی سرگرمیوں کے اثرات غذائے انسانی پر" دھواں دھار تقریریں ہورہی ہیں کہ "نہ مچھلیاں ہوتیں اور نہ ہم ہوتے"۔ ایک طبی سیمینار جس میں ڈاکٹر کم اور کمپاؤنڈر زیادہ تھے اس اہم مسئلہ پر تھا کہ "ناک کے بائیں نتھنے کے بالائی حصے پر گرد کے ذرات روکنے والے بالوں کی اوسط تعداد استوائی ممالک میں"۔ چونکہ ہمیں سخت زکام تھا اور ہمارا بایاں کیا، داہنا نتھنا تک بند تھا۔ دوسرے ہم ڈاکٹر کیا کمپاؤنڈر تک نہ تھے۔ اس لئے خاموشی سے لیٹ ہو گئے۔ آپ پوچھیں گے۔ "آپ آخر وہاں مرنے کے لئے گئے کیوں تھے؟" تو عرض کروں گا کہ۔ "دراصل گیا تو ٹھیک تھا۔ بس ذرا جمعرات اور جمعہ حساب کی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ مجھے دعوت نامہ ملا تھا۔ "شاگردان جمیل مظہری کی اصل تعداد سیمینار" کا جو جمعہ کا مبارک دن تھا۔ دلچسپی یہ تھی کہ بہت سے "دل بدلی" کے اسکنڈل

سامنے آئیں گے۔ بہنوں کی قلعی کھُلے یا کِھلے گی۔ بد قسمتی سے ہم جس کو جمعہ سمجھ رہے تھے وہ فقط جمعرات تھی۔

سیاسی سمینار کم دلچسپ نہیں ہوتے۔ ایک سیاسی سمینار کی صدارت کا شرف ہمیں اس لئے حاصل ہے کہ سمینار کے کنوینر صاحب ہمارے شاگرد رشید تھے اور ہمیں صدارت کی چھوٹی سی رشوت دیکر ہم سے بہت سے نمبر وصول کرنا چاہتے تھے۔ تو جناب سمینار تھا "جلسہ، جلوس اور بلوے فساد کے لئے کرائے کے رضا کاروں کی قومی فہرست سازی کے مسائل" ہم مسندِ صدارت پر اکڑے، بیٹھے، سوتے رہے اور ہر مسئلہ کی طرح یہ مسئلہ بھی حل ہوتا رہا۔ ہم اتنے کامیاب صدر ثابت ہوئے کہ اگلے ہی دن ہمیں "بکری کی مینگنی اور غیر ملکی مبادلۂ زر" سمینار کی صدارت پیش کی گئی۔ ماہرین معاشیات نے اس دولتِ خدا داد کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ بے اختیار ہمارا دل چاہا کہ کرسی صدارت چھوڑ کر بکری کی مینگنیوں کی تلاش میں نکل جائیں اور چند ہفتوں میں نہ صرف انہیں دوسرے ملکوں کو بھیج کر لکھ پتی ہو جائیں بلکہ ملکی معاشی حالت بھی غیر ملکی مبادلۂ زر کا ڈھیر لگا کر مستحکم کر دیں۔

ہم درس و تدریس کے مرد میدان ہیں یہ بات ہم نے صرف اس لئے کہی ہے کہ پڑھنے اور پڑھانے کے میدان میں فی زمانہ دونوں نظر نہیں آتے نہ پڑھنے والے نہ پڑھانے والے۔ اس کے باوجود اب تک یہ میدان ہم نے چھوڑا نہیں ہے۔ میدان میں کوئی نظر کیسے آئے۔ سب تو سمینار میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی "بین اقوامی نصاب تعلیم میں ہم آہنگی" پر سمینار ہو رہا ہے تو کبھی "استاد شاگرد تعلقات مہابھارت میں" پر۔ اب جو فاضل مقرر آتا ہے وہ قدیم ہندوستان میں ڈوب جاتا ہے۔ دور حاضر کی مہابھارت میں کوئی اُبھرتا ہی نہیں۔ نہ یہ بتاتا ہے کہ "تعلقات کہاں اب تو صرف مہابھارت رہ گئی ہے۔" ہم نے یونیورسٹی میں ایسے

سنسنی خیز سمینار بھی دیکھے ہیں ۔ جن میں سڑک کے اس پار" استاد کی پٹائی میں شاگردوں کا حصہ" پر سمینار ہو رہا ہے ۔ اور سڑک کے اُس پار" شاگرد کی پٹائی میں استاد کا حصہ" پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے ۔ اور یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ" طلباء کے حقوق" سمینار میں "لڑکیاں چھیڑنے ، اساتذہ پر آوازیں کسنے اور بلا امتحان کے فرسٹ ڈویژن" جیسے سنجیدہ مطالبات کئے جا رہے ہیں جن کا لڑکوں کے مستقبل سے گہرا تعلق ہے ۔

ہمارے گھر کے برابر ایک پبلک ہال ہے جو میڈیکل کالج سے بہت نزدیک ہے ۔ اس لئے اس میں طبی سمینار بہت ہوتے ہیں جن کی کارروائی براہ راست ہال لاؤڈ اسپیکروں سے کانوں تک پہنچ جاتی ہے ۔ ہمارا تجربہ ہے کہ سب سے زیادہ طبی سمینار "کینسر" پر ہوتے ہیں ۔ جیسے "سگریٹ پینے سے کینسر" "سگریٹ نہ پینے سے کینسر" "مسکرانے سے کینسر" "کھانسی سے کینسر" "چھینکنے سے کینسر" "ناشتہ کرنے سے کینسر" "کھانا کھانے سے کینسر" "سونے سے کینسر" "جاگنے سے کینسر" "غصے سے کینسر" "ہنسنے سے کینسر" "شادی سے کینسر" "رشتہ داروں سے کینسر" "پڑوسیوں سے کینسر" "شکر سے کینسر" "نمک سے کینسر" "پیدا ہونے سے کینسر" "مرنے سے کینسر" ڈاکٹر جس طرح کینسر کے اسباب بیان کرتے ہیں ۔ فوراً سمجھ میں آ جاتے ہیں اور ہم اسباب چھوڑ دیتے ہیں ۔ چاہے وہ ہمیں نہ چھوڑیں ۔ مگر باوجود سخت کوشش کے اب تک ہم پانی پینے ، مسکرانے ، کھانے ، چھینکنے ، کھانسنے ، سونے ، جاگنے ، غصے ، ہنسنے ، رشتے داروں اور پڑوسیوں سے پرہیز پر کوئی قدرت نہ حاصل کر سکے ہیں ۔ ہم "مرنے سے کینسر" سے بہت ڈرتے ہیں ۔ مرنے کے بعد اگر قبر میں خدانخواستہ کینسر ہو گیا تو پھر کیا ہوگا ۔؟ مگر اس سے بچنے کا کوئی نسخہ ابھی تک ہمیں دستیاب نہ ہو سکا ۔

ہمارا ارادہ ہے کہ "کینسر کے فن" پر ایک مستقل کتاب لکھیں اور ثابت کردیں کہ "کینسر نہ پرہیز سے ہوتا ہے اور نہ علاج سے بلکہ کینسر صرف کینسر سے ہوتا ہے اور وہ بھی صرف ہونے والے کو۔ کینسر نہ تیمار دار کو ہوتا ہے نہ اغیار کو بلکہ مریض سے زیادہ ڈاکٹر کو ہوتا ہے اور وہ بھی مرض کم مالیخولیا زیادہ۔

ہم نے بتایا تھا کہ "بیحد کامیاب۔ صدر ثابت ہونے کی وجہ سے اکثر ایسے سیمناروں کے صدر بنا دیئے جاتے ہیں۔ جن سے صحیح سلامت واپسی تقریباً غازی کا درجہ رکھتی ہے اور تعجب اس پر ہوتا ہے کہ شہادت کیوں نہ پائی"۔ چنانچہ ہمیں ایک تعلیمی سیمنار کی صدارت کا شرف حاصل ہوا جس کو یونیورسٹی کے علماء و فضلاء نے برپا کیا تھا۔ اور عالمی ادارۂ صحت کے زیر اہتمام اسے منایا جا رہا تھا۔ سیمنار کا موضوع تھا "گلی ڈنڈے پر سیمنار"۔

سیمنار میں "گلی ڈنڈے" کو فروغ دے کر قومی بلکہ بین اقوامی کھیل قرار دے کر عالمی صحت بچانے اور قوم کا وقار بلند کردینے کے ترقیاتی پہلوؤں پر دھواں دھار روشنی ڈالی جا رہی تھی سیمنار کا ایک روشن رُخ یہ بھی تھا کہ "اگر گلی ڈنڈے کا اولمپک میں داخلہ ہوگیا تو ایک سونے کا تمغہ کہیں نہیں گیا"۔

اس میں سیمنار کم اور ڈنڈے زیادہ تھے کچھ گلیاں بھی تھیں۔ ہم سیمنار میں ہمت کا لنگوٹ کس کر اس تیاری سے گئے تھے کہ شاید ہمیں بھی اور کھنڈ کے ہاتھ دکھانا پڑیں یا دور تک پدنا پڑے۔ سیمنار میں اس کثرت سے لیڈر موجود تھے کہ باوجود کوشش کے کسی دانشور کی کوئی دال نہ گل سکی۔ دال کو گلنا کہاں تھا وہ تو جوتیوں میں بٹتی تھی۔

دستور کے مطابق ہر سیمنار کسی نہ کسی موضوع پر ہوتا ہے اور بحث کرنے والے ہمیشہ موضوع سے بہک جاتے ہیں۔ آخر وہ بحث ہی کیا جو موضوع پر ہو اور وہ موضوع کیا جس پر

بحث ہو سکے۔ چنانچہ اس تاریخی سمینار میں بھی بھکنے والے اس پر اُتر آئے کہ معلوم ہوتا بحث نہیں کر رہے ہیں گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔ کچھ نے گلی ڈنڈے کی اہمیت جو ربر کی طرح کھینچ کر بڑھانا شروع کی تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ "جس ملک کو بھی دیکھئے بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم گلی ڈنڈا کھیل رہی ہے۔ حکومت اسے، مسائل سے، آفات سے۔
"حضرات! تہذیب انسانی کا اولین گہوارہ گلی ڈنڈا ہے۔ وہ شخص کیا جئے گا جو گلی ڈنڈا نہ کھیل سکے۔" کچھ مقررین نے حسب معمول رٹے رٹائے اشعار اور دوسروں سے لکھوائی ہوئی تقریروں کی مدد سے ثابت کیا کہ "غالب اور اقبال کے یہاں جو درسِ حیات ہے۔ اس میں بہت ہی غیر واضح اشارے اس کھیل کے ملتے ہیں۔ جن پر افسوس کہ ملک اور قوم نے ابتک توجہ نہیں کی ہے۔" گلی ڈنڈا کھیلنے والوں کو "اقبال کے بچۂ شاہیں" سے تشبیہہ دی گئی اور ایسی تالیاں بجیں کہ ہال گونج اٹھا۔

فلسفۂ جدید کے ایک عالم جو ترسیل کے المئے کے مدح خواں اور علامتوں کے بوجھ بجھکڑ ہیں فرمایا "گلی دراصل عام آدمی اور ڈنڈا لیڈر ہے۔" اس پر ہال کی اکثریت یعنی لیڈروں نے بہت برا مانا۔

ایک مولانائے محترم نے اپنی نورانی داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتے ہوئے فرمایا۔ "گلی تو انسان ہے۔ بنی نوع انسان اور ڈنڈا مشیئت ہے۔ یہ کھیل تو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ انشاء اللہ!"

ایک ماہر معاشیات نے کہا "گلی قیمتیں ہیں اور ڈنڈا بنئے ہیں۔ جنھوں نے اسے آسمان پر پہنچا دیا ہے۔"

ایک سائنسداں نے کہا "گلی اٹمی توپ خانہ ہے اور ڈنڈا اس کا بٹن ہے۔"

ایک اخبار نویس نے پوچھا " کہاں ہیں گلی ڈنڈا کھیلنے والے۔ ان سے میں اپنے اخبار کے لئے خصوصی انٹرویو لے آؤں۔"

اس پر سب جھینپ گئے۔ کیونکہ علم اور سیاست کے کھلاڑی تو بہت تھے مگر گلی ڈنڈا کھیلنا کوئی نہ جانتا تھا۔ اس سمینار کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ گلی ڈنڈے کے رمز و ایمائیں زندگی کے سارے پہلو سامنے آ گئے تھے۔ سوائے سیاست کے تاریک پہلوؤں کے، کہ سیاست خود بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ بار بار گلی ڈنڈے کے "شو میچ" کے مطالبے سے دل بلّیوں اُچھلنے لگتا کہ اگر سمینار کھیل میں تبدیل ہو گیا تو صدرِ مظلوم کی کیا کیا نہ درگت بنے گی۔ مگر ہر بار کھیل کی قرارداد اس لئے کھٹائی میں پڑ جاتی کہ زیادہ تر لیڈر کھیلنا نہیں جانتے تھے یا گلی ڈنڈا میچ کا افتتاح کسی نہ کسی وزیر سے کروانا چاہتے تھے۔ ایک مطالبہ جس کو لکھ کر محفوظ کر لیا گیا وہ یہ تھا کہ "گلی ڈنڈا سنگِ بنیاد" وزیرِ اعلیٰ سے رکھوایا جائے۔ مگر اس پر بھی اتفاق نہ ہو سکا کیونکہ مختلف سیاسی لیڈر مختلف وزرائے اعلیٰ کے نام پیش کر رہے تھے۔ ایک آدھ نے وزیرِ اعظم یا سابق وزیرِ اعظم کے اسمِ گرامی بھی پیش کئے مگر اعتراض ہو گیا کہ پہلے منظوری حاصل کرنے کے بعد ہی ان کے نام کا اعلان ہو سکتا ہے۔ کچھ لیڈر جو دوسرے ملکوں کی ہوا کھانے کی تاک میں تھے وہ بار بار "عالمی ادارۂ صحت" کے ڈائرکٹر جنرل کا نام پیش کر رہے تھے۔ مگر کہا گیا کہ "گلی ڈنڈے کا تعلق" ادارہ صحت ہی سے نہیں ادارہ کھیل کود سے ہے۔" اس پر تو تو۔ مَیں مَیں شروع ہو گئی۔ اور "الفاظ واپس لو" کا مطالبہ ہونے لگا۔ میں گلی ڈنڈے کا "سنگِ بنیاد" کے عناصرِ ترکیبی پر غور کر رہا تھا۔ اتنے میں "گلی ڈنڈا عالمی سمینار" کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ ایک گروپ "قومی سمینار" پر زور دے رہا تھا۔ دوسرا "عالمی سمینار" کس سطح پر بلایا جائے؟ اس کو طے کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی جائے اور

فی الحال سمینار میں پیش کئے جانے والے مسائل اور مطالبات تیار کئے جائیں گے۔"

اس تجویز کو پسند کیا گیا۔ مگر سب کمیٹی بننے میں دقت یہ تھی کہ کوئی بھی لیڈر اس پر تیار نہیں ہو سکا کہ 'سب کمیٹی' میں اسے شامل نہ کیا جائے۔ دراصل احتیاطاً پوچھا بھی یہی گیا تھا۔ "کون کون حضرات سب کمیٹی میں شامل نہیں ہونا چاہتے وہ ہاتھ اٹھا دیں؟" مگر ایک نے بھی ہاتھ نہ اٹھا کر گلی ڈنڈا سمینار میں بحران پیدا کر دیا۔

آخر مجبوراً کثرت رائے سے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی جس کے پانچ سو بہتر ممبر تھے۔ ہال میں ۲۸ سابق وزرا بھی موجود تھے جو سب کمیٹی میں شمولیت کو وقار کا سوال بنائے ہوئے تھے۔ مگر بیچارے بری طرح اقلیت میں تھے اور ان کے سابق چمچوں یعنی اکثریت نے باآسانی یہ منظور کر لیا کہ "کوئی سابق وزیر گلی ڈنڈا سب کمیٹی میں شامل نہ کیا جائے اس پر غریب سابق وزرا واک آؤٹ کر گئے۔ اس کے بعد مسائل اور مطالبات پر تجاویز کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا مطالبہ یہ تھا کہ "گلی ڈنڈا داخل نصاب کیا جائے۔" کسی نے وضاحت چاہی "داخل نصاب یا داخل اسپورٹس؟" اس پر میزیں تھپتھپائی گئیں گھونسے دکھائے گئے اور نعرے لگائے گئے۔ "ہمیں گمراہ کرنے والو ہوش میں آؤ۔" جواباً "شیم شیم" کے نعرے لگے جو بہت جلد "مردہ باد اور ناس ہو" میں تبدیل ہو گئے۔ چونکہ سمینار ہال میں ہو رہا تھا، پولیس ہال کے اندر تھی اور نہ باہر بلکہ ایک نزدیکی پارک میں جلسے کے حسب معمول بخیر و خوبی ختم ہو جانے کی توقع میں اطمینان سے بیٹھی تھی کہ اتنے میں "گلی ڈنڈا سمینار" کا پہلا ڈنڈا چلا۔ جس پر زیادہ گلی ہو گیا۔ اس کے بعد ڈائس پر لیڈروں کے بجائے جوتے چلنے لگے۔ سب سے پہلے میں خاموشی سے کھسک گیا۔ میری جگہ ایک لیڈر نے جلدی سے سنبھال لی۔ ابھی وہ صدر کا پوز بنانے میں مصروف ہی تھا کہ اس کی ناک پر ایک گندا انڈا پڑا اور منہ آملیٹ کر گیا۔ اتنے میں پولیس داخل ہو گئی۔ میں نے اپنے گھر کی کھڑکی سے جھانکا۔ "گلی ڈنڈے پر سمینار" اب ہال کے باہر ہو رہا تھا۔ ●●

اوکیات

تاریخ ہمیشہ تاریخ داں بناتے بگاڑتے ہیں۔ دراصل بناتے کم بگاڑتے زیادہ ہیں۔ اگر بگڑ جائیں تو بگاڑ پیدا کر دیں۔ روم و یونان، عرب، و ہند کی تاریخ برابر بن بن کر بگڑتی اور بگڑ بگڑ کر بنتی رہی۔ جب بھی تاریخ سازی میں جارحانہ جذبات کا بول بالا ہوتا ہے۔ کبھی مذہب کے پردے میں، کبھی حسد کی آڑ میں، کبھی دوسرے تعصبات کی آندھی میں تاریخ کے پرزے اُڑنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں سوائے تاریخ کے سب کچھ مل جاتا ہے۔ مگر تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ طوفان گذرنے کے بعد تاریخ پھر روشن ہو جاتی ہے۔ روز روشن کی طرح صاف شفاف اور چمکیلی۔

ایک بگڑے دل بلکہ دل جلے مورخ پروفیسر پی این اوک، ایسے ہی بگاڑ پیدا کرنے والوں میں ہوا کرتے ہیں جنھوں نے مشہور و معروف تاریخی عمارتوں اور آثار قدیمہ کا بھارتیہ کرن اور شدھی کرنے اور اپنی حیثیت بنانے کا دھندہ مدھوک اسٹائل میں اختیار کر رکھا ہے۔ صاحب موصوف کی مالی حیثیت بنتی ہو تو بنتی ہو مگر ان کی مورخ کی حیثیت کے بارے میں صرف اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل پھینک قسم کے دلچسپ

انکشافات سے ایک تاریخ داں بہ آسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ مسٹر اوک کا تاریخ سے بالکل وہی تعلق ہے جو 'جوکر' کا تاش کی گڈی سے ہوا کرتا ہے۔ فالسٹاف، انکل پوجر، خوجی اور چچا چھکن کو نہ پڑھا، حاجی بغلول سے نہ ملے اوک کو پڑھ ڈالا بات ایک ہی ہو گئی یعنی ہو گئی تفریح۔ دل شاد کیا، آگے بڑھ گئے۔ "اوکے اوک"۔

بلا یہ محسوس کیجیے کہ تاریخ دانی بگھارنے کے لئے تاریخ کی بُوباس بھی ضروری ہے۔ آپ نے ایک عدد گولہ داغ دیا۔!

"تاج محل کورو پانڈو کا قلعہ تھا"۔

کبھی ہم نے بھی خدا جھوٹ نہ بلوائے تو صدہا تاریخی قلعے دیکھے ہیں۔ عموماً کسی بھی قلعے کا نزول اجلال یوں ہوا کرتا ہے۔ خواہ وہ مسٹر اوک کی عین مرضی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو کہ اس میں اگلے وقتوں کے ظالم راجا کے محل یا محلات ہوں، شاہی خاندان کی قیام گاہیں، درباریوں کی اقامت گاہیں، لشکر کی کمپں گاہیں وغیرہ وغیرہ ہوں۔ خندق اور فصیل یا ان سب کے آثار ہوں۔

میرے بھائی جس محل میں خود صاحب خانہ اپنی زندگی میں دو گز سے زیادہ جگہ نہ الاٹ کرا سکے۔ اس میں قصور معاف! بھائی صاحب! اتنی بڑی مہابھارت کیسے سمائی ہو گی۔؟ رہنا سہنا تو بعد کی بات ہوئی۔ اس میں اگر وہ شاہ جہاں کی طرح آسودہ خاک بھی ہونا چاہتے تو ان کی ایک سو پانچ سمادھیاں کہاں سماتیں نہ کہ پوری مہابھارت جس میں فوجیوں اور افسروں کے علاوہ خاصی بڑی تعداد میں مشیر کار ریفری اور تماش بین بھی شامل تھے۔

تاج محل کے خالق یا "ملزم" نے تو خود مرحومہ کی قبر حسب حیثیت بنوا ڈالی تھی۔ اسی لیے تاج محل میں سوائے مکانیت کے اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ پھر کورو، پانڈو نے رہن سہن

کا کیا انتظام کیا تھا۔ کیا تاج محل کی سیڑھیوں پر سو جاتے تھے؟ آخر اس میں غریب خانہ کہاں تھا؟ کدھر تھا۔؟

شاہ جہاں تو ٹھہرا ممتاز محل کا عاشق۔ اہل مہابھارت، کس کے دیوانے تھے؟ وہ تو فرزانے تھے۔ وہ بیوی پر مرتا تھا۔ بیوی مری تو' خود بھی مرنے والی پر رہ گیا۔ پانڈو غریب تو پورے پانچ تھے۔ اور بیوی فقط ایک۔ بڑی سخت فیملی پلاننگ تھی۔ کورو اتنا موقع ہی کہاں دیتے کہ وہ کوئی مشترکہ عشق ہی کر سکتے۔ عشق خود ایک مہابھارت ہے۔ جس میں کسی دوسری مہابھارت کا گذر کہاں؟ بھئی لڑو یا محبت کرلو۔ پانڈو لڑ رہے تھے۔ شاہ جہاں محبت کر رہا تھا۔ تخت اور محل سے قید خانے تک۔ پانڈو تاریخ نہ بنا سکے تو کیا ہوا۔ اپنی داستان تو چھوڑ گئے۔ شاہ جہاں نے محبت کو تاریخ بنا دیا۔ محبت فاتح عالم ہو گئی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ تاج محل میں آج بھی نوجوان جوڑے اپنی محبت کو حقّہ کی طرح تازہ کرتے ہیں۔ استعمال سے پہلے یا بعد میں۔ غم کے مارے یا شاداں و فرحاں شادی شدہ جوڑے آج بھی تاج کے گرد منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ مگر ہم نے کسی بھی نوجوان کو جنگ کرنے یا لڑتے رہنے کا عہد کرتے تاج محل میں نہیں دیکھا۔ یعنی کورو پانڈو یا پروفیسر اوک کے کوئی اثرات تاج محل یا اس کے ماحول پر نہ پائے۔

اوک صاحب "مسجد قوت الاسلام" اور "موتی مسجد" کے بارے میں اکثر یہ بیان تحریر دیا کرتے ہیں کہ "مسجد قوت الاسلام" رادھے شیام کا مندر تھی اور دہلی کی 'موتی مسجد' موتی مل جاٹ نے بنوائی تھی۔

وہ اگر "قوت الاسلام" کے بارے میں بھی فرما دیتے کہ "اس کی تعمیر قوتِ بازو سے کی گئی تھی" تو یار دوہم مان بھی جاتے کہ اس میں کچھ نہیں تو کم از کم مزدور کے پسینے دسینے کا ذکر خیر آگیا اور اس میں ترقی پسندی کا ایک پہلو نکل آیا۔ قصہ یوں ہے کہ پرانے زمانے میں ہر

ناعاقبت اندیش فاتح بلامسٹر اوک کی تاریخ دانی کی پروا کیے، فتح ہونے والے قلعے میں عبادت گاہ بنوا دیا تھا۔ آج بھی فاتح یہی کرتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ اس باب میں تاریخ میں صرف مسجد کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے آگے تاریخ خاموش ہے۔ مگر اوک۔ اوک رہے ہیں۔

جہاں تک موتی مسجد اور موتی مل کا تعلق ہے تو ہمیں نہیں معلوم کہ موتی مل کی کون سی منت پوری ہوئی تھی کہ انھوں نے مسجد تو بنا دی شب بھر میں، مگر یہ تکلیف دہ انکشاف نہیں کیا کہ وہ اس میں نماز بھی پڑھتے تھے یا صرف مسجدیں ہی بنوایا کرتے تھے؟ اور از روئے پیشہ کرائے کے فوجی تھے یا ٹھیکیدار۔؟ مسٹر اوک کو بابر کے زمانے سے موجودہ زمانے تک پنجاب کی تاریخ کا علم ہے یا نہیں اگر نہیں جانتے تو انھیں یہ سنکر بڑی کوفت ہوگی کہ عموماً ہر جاٹ گھر کا ایک بیٹا سلامتی کے لئے گدی کی نظر کر دیا جاتا یعنی سکھ بنا دیا جاتا یعنی مسٹر اوک کے دائرے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے میاں موتی مل بہت سستے چھوٹے کہ مسجد بنا کر پیچھا چھوٹ گیا۔ انھوں نے اس کار خیر کے سلسلے میں موتی مل کا ذکر خیر کیا ہے۔ ورنہ عموماً جاٹوں کا ذکر تاریخ میں صرف لوٹ مار کے سلسلے میں آتا ہے۔ موتی مل ہوں، سورج مل ہوں یا ناگر مل۔ تاج محل اور دوسری تاریخی عمارات کے ساتھ انھوں نے جو سلوک کیا وہ سوتیلی مائیں اپنے سوتیلے بچوں اور سوکنیں اپنی سوتوں سے بھی نہ کرتی ہوں گی یا پھر محاورے میں کہ 'جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ'، یا پھر احتیاطاً مرنے والے جاٹ کی موت پر یقین کرنے کے بارے میں کہا گیا ہے' جب تک اس کی تیرھویں نہ ہو جائے اس کو مرا نہ جانیو۔

ایک بے حد غیر تاریخی انکشاف یہ ہے کہ " لال قلعہ جنگ مہابھارت کے دوران اِس تاریخی جنگ کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے للولال نے بنوایا تھا۔

ہم پہچان گئے منشی للولال جی کو، یہ فورٹ ولیم کالج میں تھے۔ منشی جی کو لڑائی دیکھنے

کا بڑا شوق تھا۔ خصوصاً مرغوں اور بٹیروں کی۔ للّو لال جی نے عمر نوح پائی تھی۔ جنگِ مہابھارت کے آغاز میں ان کی چڑھتی جوانی تھی۔ "لال" تو خیر اُن کے نام نامی اور اسمِ گرامی کا جزہی تھا۔ انھیں الہام ہوا تھا کہ ہزاروں برس بعد ایک زبان ہندوستان میں رائج ہوگی جس میں "ڈمس" کے لئے "قلعہ" کا لفظ استعمال ہوا کرے گا۔ اسی لئے انھوں نے اس کا نام "لال قلعہ" رکھ کر اُسی پر سے جنگِ مہابھارت سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا تھا۔ بلکہ کورو پانڈو سے کہلوا دیا تھا کہ "میاں اب لڑنے میں دیر نہ کرو ورنہ لال قلعہ بنوانے کا خاک مزہ نہ آئے گا۔" اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عہد مہابھارت میں اہلِ ہند نے دوربین بھی ایجاد کر لی تھی۔ ورنہ کرو کیشتر کے میدان میں ہونے والی مہابھارت لال قلعہ سے للّو لال جی کو نظر کیسے آتی؟ للّو لال جی عہدِ شاہ جہانی میں شاہ جہاں کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے کہ "ہم نے بہت مزے اٹھا لیئے۔ اب ظلِ سبحانی آپ اپنی مہابھارت اور محبّت سے اس میں لطف اندوز ہوا کریں۔"

مسٹر اوک کی دور کی کوڑی کی بنیاد پر ہم یہ مان سکتے ہیں کہ مسٹر اوک اور تاریخ دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر ان میں دلچسپی کا اظہار اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تاریخ کا تاریخ سے زیادہ ظرافت سے تعلق ہے۔

اسی رعایت سے ہم مسٹر اوک کا شمار ان سمّ پیشہ حضرات میں کرتے ہیں۔ جو گلی گلی "رسل بٹّہ بنوالو" کی طرح "تاریخی نام بدلوالو" کی صدائیں لگایا کرتے ہیں ورنہ کوئی بات نہیں۔ جن کا یہ اس حسرت سے ذکر کرتے اور داغِ دل شمار کرتے ہیں وہ تاریخی عمارتیں ضرور کثرتِ استعمال سے اسلامی ہوگئی ہیں۔ ہمیں خود بھی بہت سی تاریخی عمارتوں کے بارے میں شبہ تھا کہ ان کا تعلق اغیار نہیں اخیار سے نہ ہے۔

مسٹر اوک کو انھیں اپنی تاریخ کی دلدل میں اچھالنا چاہئے۔ جیسے اٹلی میں "پیسا کا مینار"

جو دراصل ایک لاٹ تھی جسے پورس نے سکندر اعظم کو بطور نذرانہ پیش کیا تھا۔ یونانیوں نے اچھی قیمت پر رومیوں کے ہاتھوں اسے فروخت کر دیا تھا۔ رومی لے جانے کو تو لے گئے مگر وہ اسے سیدھا نہ کر سکے۔ وہ ترچھا ہی ہو کر "پیسا کا مینار" ہو گیا اور ہو گئی دنیا بھر میں رومیوں کی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واہ واہ۔ اور "پیسا کا مینار" کی اوک اسٹائل اسٹوری ہو گئی تیار، ہو گیا اس کا بھی بھارتیہ کرن۔

مسٹر اوک کو ہمارا دوستانہ مشورہ ہے کہ وہ گڑے مُردے اُکھاڑنے کے علاوہ کبھی کبھار ایک نظر سامنے کے زندوں پر بھی ڈال لیا کریں بس ایک نظر۔ جیسے "انڈیا آفس" لائبریری۔ اسم مبارک ہی سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک ہندوستانی دفتر تھا جس کو انگریز کرینیں لگا کر اُٹھا لے گئے تھے اور اس میں ہندوستان سے سرقہ کی ہوئی کتابوں کی لائبریری کھول ڈالی۔ جس کی واپسی کے لئے اگر وہ کوشش کریں اور لائبریری نہ سہی دفتر ہی اٹھوا لائیں تو وہ اس میں اپنی تاریخ کا دفتر کھول سکیں گے۔

لنکا اور برما کے مندر (پیگوڈا) جاپان میں سورج دیوتا کے مندر کے بارے میں بھی ہو جائے کچھ گل افشانی گفتار کہ یہ پیگوڈا اور مندر بودھوں اور آریوں نے بھی جنوبی ہند میں دراوڑوں کی تالیف قلب کے لئے بنوائے تھے۔ مگر بودھوں کی طرح دراوڑ بھی لنکا، برما سے پسپا ہوتے وقت انھیں چپکے سے جیب میں ڈال کر چمپت ہو گئے۔ ان مشہور تاریخی آریہ مندروں کو انھوں نے دراوڑوں کے پیگوڈا میں تبدیل کر دیا۔

کم از کم سورج بنسی خاندانوں کو مسٹر اوک کو متحرک کرنا چاہئے کہ وہ حرکت میں آئیں اور سورج دیوتا کا مندر اہلِ جاپان سے بلا تاخیر واپس لائیں۔ جن کے لئے وہ حکومت جاپان کو الٹی میٹم کے طور پر ایک کتاب لکھ کر تارپیڈو کر دیں۔

"جاپان میں سورج دیوتا کا مندر ہندوستان میں ایک ہندو راجا نے بنوایا تھا۔"

اسی کے ساتھ مسٹر اوک کو چاہیے کہ وہ دنیا بھر کی تاریخی عمارتوں کی فہرست مکمل کرنے کے بعد دنیا کے ہر ملک سے اس بات کا مطالبہ شروع کر دیں کہ برائے مہربانی ہماری چیزیں ہمیں واپس بھیجنا شروع کر دی جائیں۔ امریکا ریڈ انڈین اور انڈیانا واپس کر دے۔ روس ہندوکش اور جنوبی مشرقی ایشیا ہمیں جاوا، سماترا اور بالی کے مندر عنایت فرما دے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ مسٹر اوک مشہور عالمی تاریخی عمارتوں کا حسب نسب، مذہب، ذات پات درست کر کے "ودیا بھون" سے ان کا شجرہ چھپوا کر ملکوں ملکوں میں بھجوائیں اور انھیں واپس منگوانے کا اہتمام "ہفت عجائبات عالم بھارتیہ کرن اینڈ شدھی ایسوسی ایشن" کے تحت کریں۔ ان کی اس تحریک کے کُل اخراجات محکمہ سیاحی بڑی فراخدلی سے برداشت کرے۔ کیونکہ اس سے سب سے زیادہ آمدنی محکمۂ سیاحی کو ہوگی۔ دنیا بھر کے سیاح جہانیان جہاں گشت ہندوستان جنت نشان پر ٹوٹ پڑیں گے۔

مرزا آمد بیگ

آپ سے ملیے! آپ ہیں مرزا آمد بیگ۔ زندگی کی چالیس بہاریں لوٹ چکے ہیں مگر کون مسخرا ان کو تیس سے زیادہ سمجھنے پر تیار ہوگا۔ بال سیاہ۔ چہرہ اس سے بھی زیادہ سیاہ۔ نفیس چکن کے چُنے ہوئے کُرتے کے اُوپر سے جَھم جَھم کرتی ہوئی سفید بُراق شیروانی اور اس سے بھی کہیں زیادہ سفید چھالٹین کا پاجامہ۔ جسم و لباس کی آمیزش گویا صبح اور شام آپس میں گلے مل رہے ہوں۔ ترشی ترشائی مونچھیں۔ بھرا بھرا جسم، گسی بوٹی، میانہ قد، کھایا پیا چہرہ، بغل میں ڈپلومیٹک بیگ، پیشہ کے اعتبار سے بیک وقت، خدائی خدمتگار، خادمِ قوم، مشکل کُشا، غرض علاقے کی اکیلی ایسی ہستی جس پر ہر شخص بھروسہ کرتا ہے اور کرے بھی کیوں نہ؟ ہر کس و ناکس کے دُکھ درد میں موجود رہتے ہیں۔ یہ جہاں دکھائی دیں، سمجھ لیجئے کوئی فتنہ ہے جو اُن کے پہنچنے سے کہیں دب جاتا ہے اور کہیں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جس کا سہرا ہمیشہ انُ کے سر باندھا گیا۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرنا، ہر ضرورت مند یا مظلوم کی دست گیری کے لئے اُٹھ کھڑا ہونا ان کا دن رات کا محبوب مشغلہ ہے۔ صبح ان کی آنکھ کھلتے کھلتے غرض مندوں کا ایک لشکر ان کی بیٹھک میں جمع

ہو جاتا ہے۔ کوئی منہ دھونے کے لئے پانی رکھ رہا ہے، کوئی گھر سے ناشتہ لئے چلا آ رہا ہے۔ جس سے فراغت حاصل کرنے کے بعد یہ سب کی سنتے ہیں۔ کسی کی بکری کوئی کھول لے گیا تو یہ فوراً اس سے بکری کا حلیہ، عادات واطوار وغیرہ پوچھ کر فوراً نوٹ کرلیں گے۔ کسی کی لڑکی امتحان میں اگر نروس ہو کر بغیر پرچہ کئے آگئی تو یہ اُس کو فسٹ کلاس دلوانے کے سلسلے میں نام، مضمون، رول نمبر وغیرہ اندراج کرلیں گے۔ کسی ہونے والی دعوت کے امکانات پر تقریر، نئے تعلیم سے فارغ ہوئے نوجوانوں کو نوکری دلوانے اور تجارت میں لگانے کے بارے میں وعدوں کا سلسلہ اس وقت تک نہیں ختم ہوتا جب تک کہ کسی حاکم کی گاڑی یا کوئی بہت بڑا آدمی انہیں لینے نہ آجائے جس کا ہمیشہ ان کو بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عقیدت مندوں میں سے کوئی منچلا ہمیشہ انہیں کرایہ کے رکشے پر اپنے کام کو کروانے کی خاطر لے جاتا ہے۔ ہر آنے والے سے وہ ہنس ہنس کر خیریت دریافت کرنے کے بعد آنے کا سبب پوچھتے ہیں، جسے بے حد سنجیدگی سے سنتے اور اس کے بعد ہمیشہ زور سے ہنس کر کہتے ہیں ــــ "بس اتنی سی بات تھی بے وقوف کہیں کے۔ اس کے لئے اتنی تکلیف اٹھائے اور پریشان ہونے کی کیا بات تھی۔ مجھے بلوا کر حکم دیتے ارے بے وقوف داس! یہ تو چٹکی بجانے میں ہو جائے گا۔" اور مخاطب ریشہ خطمی ہو کر جواب دیتا ہے۔ "بس بس حضور اگر آپ اتنا کردادیں تو میرا بھی بیڑا پار ہو جائے۔"

علاقے بھر کے لوگ ہمیشہ مرزا صاحب کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے۔ اگر اس بار یاترا میں ایک بھی کامیاب ہو جاتا تو محلے میں ایک بار پھر مرزا صاحب کی دھوم مچ جاتی۔ حاجت مندوں اور عقیدت مندوں کا ان کی بیٹھک میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔

ہمیشہ گھر سے رخصت ہوتے وقت، مرزا صاحب گھر اور گھر والوں کو بجائے

"خدا حافظ" کہنے کے بلا تکلف پبلک کے سپرد کر دیتے۔ پھر دن بھر اُن کے مُرید خوشی خوشی ان کے گھر کا سودا سُلف لاتے، مکان، پانی، بجلی اور لانڈری کے بل ادا کرتے، راشن کے ڈھیر لگا دیتے اور وہ بھی اس سلیقے سے کہ نہ اس سلسلے میں کبھی مرزا صاحب کو کسی سے کچھ کہنا پڑا اور نہ کبھی کسی نیاز مند نے لوٹ کر احسان جتانے کی ضرورت محسوس کی۔

مرزا صاحب ہمیشہ خود دار واقع ہوئے ہیں۔ اگر کبھی کسی کے گھر اکیلے پیدل بھی جانا پڑ گیا۔ کیونکہ بقول اُن کے "کبھی کبھی معدہ کی صفائی و صحت کی درستگی کے لئے چہل قدمی حکمائے نے ضروری قرار دی ہے اور یہی میری صحت کا راز ہے۔" مگر جن صاحب کے گھر انہیں پہنچنا ہوتا، اس سے ایک چوراہا پہلے وہ ضرور رکشا کر لیتے جس پر چلنے سے پہلے وہ اس کا حساب صاف کر دیتے اور اُترتے وقت میزبان کی موجودگی میں ذرا زور زور سے واپسی کے لئے وقت ضرور بتاتے۔ حالانکہ یہ ان کی محض انکساری ہوتی۔ ورنہ ان کے پڑوسی بخوبی جانتے ہیں کہ ہمیشہ شام بارات کو اُن کی واپسی کسی نہ کسی بہت شاندار موٹر میں ہوتی ہے۔ بعض حاسدوں کا خیال ہے کہ شہر بھر کے موٹر نشینوں کے ڈرائیوروں سے مرزا صاحب کے ذاتی تعلقات ہیں جب کہ خود ہم نے انہیں بارہا منہ در منہ مالکانِ موٹر سے محوِ گفتگو پایا۔

مرزا صاحب گھر سے نکل کر ہمیشہ کسی نہ کسی بڑے حاکم، نواب، راجہ یا بزنس مین کے پاس عادتاً ضرور جاتے ہیں، مگر وہ کبھی کسی کے پاس بھی اپنے کام سے جاتے نہیں دیکھے گئے۔ پبلک کی خدمت کے جذبے کی وجہ سے بالائی طبقہ انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا چلا آرہا ہے۔ یہ بالکل مختلف مسئلہ ہے کہ وہ بڑے آدمیوں کے بھی کام آہی جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پبلک اور خادمانِ قوم کے درمیان رابطے کی کڑی

بھی ہیں۔

مرزا صاحب نے بلا کا حافظہ پایا ہے۔ انہیں قرب و جوار تک کی اہم ہستیوں کی سات پُشت آگے اور پیچھے کے شجرے زبانی یاد ہیں۔ وہ کسی سے بھی ملنے پر ہی حاضرین کو ایک سانس میں بتادیں گے ــ "ارے صاحب آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔ آپ تو خاندانی رئیس ابن رئیس ہیں۔ آپ کے خاندان میں تو اٹھارہ جاگیردار، انیس زمین دار، پندرہ حکام، گیارہ بزنس میگنٹ اور نو ڈی ڈی ٹی ہیں۔ آپ کے بزرگوں نے تو ہر موقع پر حاتم و سکندر کو مات دی تھی۔ صاحب ہم تو آپ کے پُرانے نمک خوار ہیں۔"

عموماً وہ اہم قسم کی ہونے والی محفلوں میں صدر محترم یا معزز مہمان کے دائیں بائیں ہمیشہ پائے گئے۔ یُوں تو ان کی شخصیت میں اتنی کشش اور زبان میں ایسی شیرینی و گھلاوٹ ہے کہ وہ جہاں پر ہوتے ہیں وہیں سے چپکتے ہیں۔ بات کرنے میں نہ صرف منہ سے پھُول جھڑتے ہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے گویا کسی بہت بڑی بین الاقوامی ہستی کی خدمات کے اعتراف میں زبردست سپاس نامہ پیش کر رہے ہیں۔ اس موقع پر ان کی آواز جو ترنم پیش کرتی ہے اُس کو موسیقی کی اصطلاح میں استادوں نے جوگیا راگ کہا ہے۔

ایک اہم ترین دعوت کے موقع پر ہمارا اور مرزا صاحب کا ساتھ ہو گیا۔ موصوف صاحبِ خانہ سے مستقل کانا پھوسی میں مصروف تھے، عرض کر رہے تھے ــــــــ

"ارے صاحب ناممکن! اس دور میں اب آپ کا ایسا حاتمِ وقت کہاں ملے گا آپ تو خاتمِ حاتم ہیں۔ ہزاروں سے سلوک کئے۔ بھئی واللہ جو کبھی کسی پر احسان بھی جتایا ہو۔ آپ تو ماشاء اللہ بڑے خاندانی ہیں۔ آپ کی خاندانی شرافت اور وجاہت کا کیا کہنا، واللہ کیسی کیسی ہستیاں آپ کے خاندان میں گذر گئیں۔ ہائے کیا لوگ تھے۔ پھر صاحب

آپ کی شرافت وضع داری کے تو ڈنکے بجے ہوئے ہیں۔" اور صاحب خانہ نے معزز مہمان کے سامنے سے مُرغ کی پلیٹ اُٹھا کر موصوف کی جانب بڑھاتے ہوئے اپنا سینہ خوشی اور فخر سے کچھ اور پھُلا لیا۔ چہرہ کی رونق بتا رہی تھی کہ میزبان کا دماغ اب ساتویں آسمان سے بھی کچھ اوپر ہی پہنچ چکا ہے اور بے پئے ڈھائی بوتل سے کم نشہ نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ غرض مرزا صاحب کا یہ شو بھی باکس آفس ہٹ گیا اور یہ محفل بھی انہیں کے ہاتھ رہی۔ میزبان بجائے معزز مہمان خصوصی کے مرزا صاحب کو خاص طور پر اپنی موٹر سے ان کے گھر چھوڑنے آئے اور پھر آنے کا وعدہ لے کر بدقتِ تمام ٹلے۔

جب مرزا صاحب کی اس پذیرائی کا تذکرہ میں نے واپسی پر گھر میں کیا تو بولیں ۔"ارے مرزا نادی مرزا موئے مکھن باز۔" گر ہم نے بیگم کی بات کا قطعاً برا نہ مانا کیونکہ انہوں نے آخر کب کسی کی خطا معاف کی تھی۔ پھر بھی مجھے بیگم کی یہ بات قطعاً پسند نہ آئی اور خاموش ہو گیا۔

مرزا صاحب میں بلا کی آمد ہے۔ شاید آپ کہیں کہ اس آمد سے مرزا صاحب کو کیا فائدے پہنچے تو جناب اول تو یہ کہ مرزا صاحب اپنے گاؤں سے ہمارے علاقے میں خالی ہاتھ تشریف لائے تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ روزگار کی تلاش میں رہے لیکن جلد ہی ان کی سمجھ میں یہ نکتہ آگیا کہ خدمتِ خلقِ خدا فرض ہے۔ چنانچہ وہ دن ہے اور آج کا دن قسم لے لیجئے جو کبھی انہوں نے اپنے بارے میں ذرا بھی کوشش کی ہو۔ سارے زمانے کے لئے بھاگ دوڑ کرتے ہیں، سر کھپاتے ہیں، جوتیاں چٹخاتے ہیں۔ اب اسی کو ان کا روزگار کہہ لیجئے، جو خوب چلتا ہے۔ پچھلے دس سالوں میں انہوں نے پندرہ بلڈنگیں کھڑی کر لی ہیں جن سے کرایہ اتنا وصول ہو جاتا ہے کہ وہ اگر صرف کرایہ کھائیں تو کئی پشتوں کو کافی ہو۔ دوسرے ہر الیکشن میں بلا مقابلہ منتخب ہو جاتے ہیں تیسرے وہ علاقے بھر کے سب سے با اثر، خوش مزاج اور ہر دل عزیز آدمی ہیں۔

اُستادِ حیرت

اُستادوں پر بات شروع ہوئی تو اُستادِ حیرت کے قصّے دوستوں کی محفل میں چھڑ گئے۔ کسی نے کہا۔

"وہ تو اُستادوں کے اُستاد ہیں۔؟" ۔ کوئی بولا۔

"اُستادِ حیرت کے کیا کہنے! وہ تو نٹور لال کے بھی استاد ہیں۔"

ایک صاحب بڑی دور کی کوڑی لائے۔ "صاحبان! عورت ڈلا اور چھبیلی بھٹیارن کے نام تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے۔ یقیناً استادِ حیرت چھبیلی بھٹیارن کے صاحبزادے اور عورت ڈلا کے پرنواسے ہوں گے۔"

ایک اور مہربان نے انکشاف کیا۔ "اُستادِ حیرت اگر عورت ڈلا کے پرنواسے ہیں تو پھر اِس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مرزا ظاہر دار بیگ کے پرپوتے، ابن الوقت کے لکڑپوتے اور پروفیسر بین الھتّی کے چھوٹے بھائی ہوئے۔"

میں نے اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات! چونکہ آپ سب نہ صرف خاندانی بلکہ اِس حساب سے موصوف ہی کے بھائی بند معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا کے شجرے کی تفصیلات ظاہر

ہے کہ آپ خوردوں سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔؟" ایک صاحب جو ہماری محفل میں نووارد کی حیثیت رکھتے تھے چمک کر بولے۔

"اُستاد کی شان میں یہ گستاخیاں؟ خاموش! اُستاد کا مذاق؟ جائے حیرت۔ بولو، تم میں سے کوئی استاد حیرت سے ملا بھی ہے؟۔"

سب نے یک زبان ہوکر عرض کیا۔

"جی نہیں! نہیں!! نہیں!!! بالکل نہیں!!! ہم محض سُنے سُنائے قصّے دُہرا رہے ہیں۔ ملے نہیں ہیں۔ ملنے سے ڈرتے ہیں۔ مگر حسرتِ دیدار اور اشتیاقِ ملاقات باصد احتیاط ہے۔" ۔وہ بولے۔

"پھر تم کیا جانو اُستاد اور اُن کی اُستادیوں کو، میں جانتا ہوں۔ مجھے بھی اُستاد چوٹ دے چکے ہیں۔" سب ان کے پیچھے پڑ گئے۔

"جب آپ اُستاد سے چوٹ تک کھا چکے ہیں۔ تو پھر آپ ضرور ان کا آنکھوں دیکھا اور کانوں سُنا کوئی فراڈ سُنائیے۔"

وہ صاحب ذرا اکڑ کر، ہوا باندھتے ہوئے بولے۔

"اُستاد حیرت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کے بارے میں سب کچھ جاننے، سمجھنے، بوجھنے کے باوجود جو بھی ان سے ایک بار ٹکرا جائے۔ یا وہ کسی غریب پر مہربان ہو جائیں، پھر کیا مجال کہ اس کا کباڑا نہ ہو جائے۔ دیوالہ تو خیر اُستاد پہلی ہی ملاقات میں نکال دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود استاد کی ناگاسرگرمیاں برابر جاری رہتی ہیں۔ جب تک کہ دو چار پرواز کے لئے پھڑپھڑائیں اس وقت تک دس بیس، مزید ان کی پھنکی میں آ چکے ہوتے ہیں۔"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔

"میں نے اپنی زندگی میں اتنا ذہین، نرم گرم مزاج، خوش لباس، خوش مذاق اور پڑھا لکھا فرد نہیں دیکھا۔ باتیں ایسی چھتے دار کہ بس اُستاد کہا کریں اور ہم سُنا کریں۔ میک اپ کے بعد سانولا رنگ، کھڑی ناک، کتابی چہرہ، بادامی بناجیسی آنکھیں، کلین شیو، برائے نام سر پر بال جو کبھی گھنے ہوا کرتے تھے۔ کبھی سوٹ، کبھی پینٹ بوشرٹ، انگریزی، اردو، فارسی اور ہندی پر یکساں قدرت۔ دُنیا کے ہر موضوع، ہر واقعہ میں دخل بات بات پر برمحل مصرعے، اشعار اور لطیفے۔"

ایک صاحب نے ٹوکا۔

دیکھیے حضرت! شاگردی کا حق کسی اور موقع پر ادا کر دیجیے گا۔ اِس وقت تو اُستاد کے چند کمالات بیان کر دیجیے۔"

وہ بولے۔

"یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب اُستاد مراد آباد میں بجائے مُردے زندہ کرنے کے اپنے کمالات سے زندوں کو درگور کر رہے تھے۔ بیک وقت دو تعلیمی اداروں سے تنخواہ وصول کر رہے تھے۔ اور تازہ تازہ ایک بارات کے منتظم اعلا اور خزانچی بنے تھے۔ بارات کو کلکتہ لے جانا تھا۔ اُستاد نے سب کو ٹرین کے ایک ریزرو ڈبّے میں بڑی شان سے بٹھا دیا۔ جب گاڑی کئی اسٹیشن پار کر چکی تو بارات کے کمپارٹمنٹ میں ایک ٹکٹ چیکر آ گیا۔ اُس نے کہا کہ "یہ ڈبّہ آپ لوگ فوراً خالی کر دیجیے، کیونکہ یہ فوجیوں کے لئے ریزرو ہے۔" اب اُستاد کی تلاش شروع ہوئی، کیونکہ ٹکٹ تو انہیں کے پاس تھے۔ معلوم ہوا کہ اُستاد نے "فوجیوں کے لئے مخصوص" کو مٹا کر کھریا سے "بارات کے لئے ریزرو" لکھ دیا تھا۔ بارات کو سوار کرا کے غائب ہو گئے تھے۔ باراتیوں نے ٹکٹ اور جرمانے کی رقم ادا کر کے کسی نہ کسی

طرح دوسرے ڈبوں میں پناہ لی ورنہ پڑگئی تھیں پوری بارات کے لیے ہتھکڑیاں"

انہوں نے کہا۔ ایک زمانے بعد اچانک، ایک ہوٹل میں اُستاد مل گئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ بڑے مصروف تھے۔ انہوں نے ایک اور مکان خرید لیا تھا۔ جسے وہ معقول پگڑی، سلامی اور کرایہ پر میرے ایک پڑوسی کو بخش رہے تھے۔ غرض انہوں نے بڑی مروت کرتے ہوئے خاصی رقم معاف کرتے ہوئے کنجی ان کے سپرد کردی۔ تاکہ وہ اگلے دن صبح اِس نئے مکان میں منتقل ہوجائیں۔ میرے پڑوسی سامان سے لدپھند کر صبح صبح جب اُستاد کے مکان پر پہونچے تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اُن جیسے چار دیگر کرایہ دار مع اسباب خانہ داری اور کُنجی کے موجود تھے۔ سب اُستاد کو بیعانہ دے چکے تھے۔ کسی کی بھی کنجی مکان کے تالے میں نہ لگ سکی۔ تالہ بڑا جہازی تھا۔ اِس لئے اس کے ٹوٹنے کا بھی امکان نہ تھا۔ سب اسی پریشانی میں تھے کہ اچانک ایک موٹر رُکی اُس میں سے ایک صاحب نے اُتر کر تالا کھولا۔ بیوی بچوں اور سامان کے ساتھ اندر چلے گئے۔ سامان اُتروانے میں ان کی نظر مکان کے نئے مالکوں پر پڑی۔ تو انہوں نے اُن سب کی اچھی خاصی پریس کانفرنس کر ڈالی۔ معلوم ہوا کہ صاحب خانہ گرمیوں کی چھٹی میں پہاڑ گئے ہوئے تھے۔ گھر کھانے اور بٹیروں کے دانے پانی کے لئے کُنجی اُستاد حیرت کو دے گئے تھے۔ اُستاد نے صورت حال سے معاشی فائدہ اُٹھا کر پانچوں سے پگڑی، کرایہ اور ایڈوانس وصول کر لیا تھا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد بھی اُستاد کا سُراغ نہ لگ سکا۔ مجبوراً بے چارے تھک کر بیٹھ رہے۔"

وہ صاحب بولے "مگر اِس سے بھی حیرت کا واقعہ تو بڑے میاں کا پاسپورٹ بنوانے والا ہے۔"

سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"بھلا! اُس کا کیا اسکینڈل ہے۔؟"۔ وہ بولے۔

"ایک بڑے میاں کے صاحبزادے کسی ملک میں بڑے عہدے پر تھے۔ انہوں نے والد کو اپنے ساتھ رکھ کر ان کی خدمت کرنے کے خیال سے اپنے پاس بلوایا۔ بے چارے ضعیف آدمی، دفتری بھاگ دوڑ سے معذور۔ اُستاد کو معلوم ہوا۔ فوراً پہونچے، انہیں سمجھایا۔

"آپ میرے دوست کے والد ہیں اس لئے بجائے میرے باپ کے ہوئے۔ آپ کا پاسپورٹ بس دو گھنٹے میں بنوا دوں گا۔ آپ سفر کی تیاری کریں۔" اس کے بعد استاد نے ان بزرگ کے پاس دن میں تین چار مرتبہ جانا شروع کیا۔ ہر بار مختلف کاغذات پر دستخط کرواتے اور ان سے کچھ اور روپے لے جاتے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پاسپورٹ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ انہیں دے کر ہوائی اڈے تک پہونچا دیا۔ بڑے صاحب ہوائی اڈے میں داخل ہوتے ہی روک لئے گئے۔ کیونکہ کسی اور کے پاسپورٹ پر ان کی تصویر چپکا دی گئی تھی۔ اور ٹکٹ ہوائی جہاز نہیں بلکہ سنیما کا تھا۔ بڑے صاحب روتے پیٹتے واپس پہونچے تو گھر میں ایک کرایہ دار تھا جس کا کسی مہاجن سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ اُستاد نے ایک ایسے کاغذ پر بھی دستخط کرا لئے تھے جس کے مطابق اب یہ مکان ان کا تھا۔ جسے انہوں نے ایک مہاجن کے ہاتھ بیچ کر اس میں ایک کرایہ دار بھی بسا دیا تھا۔"

کسی نے پوچھا۔ "وہ اُستاد کا جو دعوت والا لطیفہ مشہور ہے؟"

انہوں نے کہا۔

"یہ محض اتفاق ہے کہ وہ دعوت میرے ہی اعزاز میں کی گئی تھی۔ ہوا یوں کہ اُستاد کو کسی طرح یہ بھنک لگ گئی تھی کہ میں آج پچاس ہزار روپیہ بینک میں جمع کردوں گا۔ جس کے لئے گھر سے بیگ لانا بھول گیا ہوں۔ اُسے ابھی منگواؤں گا اور ایک دوست کی دعوت کے سلسلے میں گھر پر

ایک مرغا بھیجوں گا۔ اُستاد فوراً مرغا دبائے ہوئے پہونچ گئے۔ گھر میں کہلوایا۔ صاحب نے مُرغا بھجوایا ہے اور بیگ منگوایا ہے۔ بیگم صاحبہ نے مُرغا رکھ لیا اور بیگ دے دیا۔ بیگ لیکر جو اُستاد غائب ہوئے تو کئی سال کے بعد ایک ہوٹل سے نکلتے ہوئے ملے۔ فوراً دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اپنے کمرے میں لے گئے۔ اور بولے۔

"روپیہ پیسہ کے لئے گھبرانے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ آجکل جواہرات کی تجارت کر رہا ہوں۔ رات کو جملہ احباب کے ساتھ میرے یہاں کھانا کھائیے۔ بطور تاوان پچاس نہیں ساٹھ ہزار کا چیک کاٹ دوں گا اور کیش بھی کرا دوں گا۔"

دعوت میں دس بارہ دوستوں کے ساتھ شریک ہوا۔ شاندار کھانوں پر سب ٹوٹ پڑے۔ کھا کر ہاتھ منہ دھو کر دیکھا تو اُستاد کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد رد دھو کر ہم نے اپنے اعزاز میں ہوئے "والی دعوت کا لمبا چوڑا بل ادا کیا۔ پھر سُنا کہ آج کل اُستاد الکشن کا 'کاروبار' کر رہے ہیں۔"

کسی نے پوچھا۔

"الکشن کا کاروبار کیسے ہوتا ہے؟"—— وہ بولے۔

"سُنا یہ ہے کہ الکشن میں مختلف پارٹیوں کو ووٹ کاٹنے کے لئے ڈمی امیدوار کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اُستاد نے یہ کمال دکھایا کہ مختلف مقامات سے کسی نہ کسی پارٹی سے روپے لے کر ڈمی کنڈی ڈیٹ کی حیثیت سے کھڑا ہونا منظور کر لیا۔ جب کاغذاتِ نامزدگی داخل کئے جانے کی خبریں اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں تو اُستاد کا بھانڈا پھوٹ گیا۔"

سب اُستاد حیرت کے فراڈ پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے۔ نووارد اُٹھ کر چل دیا۔

اُن کی کرسی پر رکھے ہوئے ملاقاتی کارڈ کو ایک صاحب نے اُٹھایا تو بے اختیار اُن کے منھ سے بے چیخ نکل گئی۔ جلدی سے سب نے وہ کارڈ دیکھا۔ اُس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"استاد حیرت"

مارے حیرت کے سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

———— ❖ ————
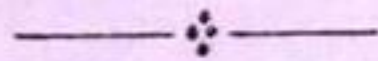
امتحان میں نقل کا فن

امتحان میں نقل کے فن پر اپنے ارشادات اور ملفوظات شائع کرانے کا خیال ہمیں اس وقت آیا جب ہم نے اس عظیم فن پر تحقیق میں اتنی شہرت حاصل کرلی کہ بہت سی یونیورسٹیوں نے ہمیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری کی بالکل مفت پیش کش کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارے تجربات کی روشنی میں کم از کم نقل ہی کی مدد سے موجودہ امتحانی نظام برقرار رکھ سکیں۔ بلا امتحان کے پاس کرنے کی بڑھتی ہوئی وبا کی کچھ روک تھام کر سکیں۔ بہت سی امریکی کمپنیوں نے اپنے اپنے تعلیمی کارخانوں میں ہم سے نقل کا اسپیشل شو کرنے کی بھی پیش کش کی اور غیر ملکی زر مبادلہ کمانے کا سنہرا موقع دیا۔

ہندوستانی طریقۂ نقل کے بارے میں اپنے تصورات اور تجربات ہدیۂ ناظرین ہیں تاکہ ان کی مدد سے، جیسے کامیابی نقلچیوں کی چوکھٹ چھوا کرتی ہے اسی طرح آپ کے دروازے اور پھاٹک سے بھی بوس وکنار کرے۔ جیسے نقل نے بڑے سے بڑے پھسڈیوں کے دن پھیرے ویسے ہی آپ کے بھی پھیرے۔ مگر پہلے آپ نقل کی ابتدا تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ وغیرہ پر ہمارے نظریات، نقطۂ نظر وغیرہ سمجھ لیں تاکہ نقل پر آپ پورے طور پر حاوی ہو سکیں۔

ہماری تحقیق کا ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ انسان اور نقل کے بادا آدم، بزرگانِ ڈارون کی طرح نرے بندر تھے۔ کسی بھی لڑکے کی حرکتیں دیکھ کر ہماری بات پر بہ آسانی یقین کیا جاسکتا ہے۔ آج بھی بات بات پر لڑکوں کو بندر کہا جاتا ہے۔ بندر اور لڑکے بلا کے نقلچی ہوتے ہیں۔ بندر کو مارو گولی، آدمی کی کہو جو ازل سے نقل کرتا آیا ہے۔ نقل کرنا اس کا پیدائشی حق ہے جب کہ پیدائش خود ایک نقل ہے۔

یوں سمجھو میاں! ہر انسان کو پیدا ہوتے ہی زندگی کے مسلسل امتحانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنہیں پاس کرنے کے لیے وہ نقل کا سہارا لیتا ہے۔ نقل ہی سے وہ چلنا، بولنا، کھانا، پینا، لڑنا، جھگڑنا، چوری چکاری، بے ماری، بے ایمانی، قتل و غارت اور دیگر فنونِ تقلید سیکھتا ہے۔

نقل آدمی خواہ مشینوں اور ملاوٹ کی کرے یا قدرتی مناظر کی، امتحان میں کتابوں، کاپیوں سے نقل بھی نقل ہی ہے جو درحقیقت اصل کی تلاش ہے۔ ہمارا ایک مشہور قول ہے کہ "اس نقلی دور میں اگر آدمی سے نقل کا مادہ نکال لیا جائے تو اصلیت میں اس کے پاس کچھ بھی نہ رہ جائے۔"

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ امتحان میں نقل کرنا آرٹ ہے یا سائنس؟ نقل برائے نقل ہے یا نقل برائے زندگی؟ نقل جدیدیت ہے یا ترقی پسندی؟ خیر اس بحث میں کون پڑے۔

پرانے زمانے میں لوگ نقل کو آرٹ سمجھتے تھے۔ اس زمانے تک ایٹمی دھماکے نہ ہوسکنے کی وجہ سے سائنس کا اتنا زور نہ تھا۔ نہ نقل میں اتنا زور پیدا ہوسکا تھا کہ وہ کوئی دھماکہ کرسکتی یہ زور تو بعد کے زمانے کے نقلچیوں نے پیدا کیا۔

نقل برائے نقل تو خیر فطری ہوئی کہ صاحب زادے یا صاحب زادی نقل مطابق اصل ہی کر لیتے ہیں اور کم از کم ان امیدواروں سے بہتر ہیں جو نقل کے لیے بھی ایک مددگار بطور "اٹیچی امتحان" رکھتے ہیں ورنہ اس کو ہمیشہ ببانگ دہل نقل برائے زندگی مانا گیا ہے۔ پاس ہونا ذریعہ نجات

ہی نہیں وسیلۂ معاش بھی ہے کہ روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر۔ پاس ہو کر نوکری پائیں گے۔ زندگی میں نوکری یا چھوکری کے لیے پاس ہوں گے اور پاس ہونے کے لئے نقل کریں گے اور نقل کے لیے امتحان دیا کریں گے۔ گھی کہاں گیا کھچڑی میں کھچڑی کہاں گئی گھی میں۔

نقل برائے جدیدیت ان معصوم امیدواروں کے لیے تسلیم کی گئی ہے جو نہ پڑھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ نقل کی نقل پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے جواب علامتی ہوتے ہیں اور تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اس قدر ابہام ہوتا ہے کہ ابلاغ کا عمل پورا نہیں ہو پاتا، لہٰذا ممتحن ان کی نقل کو جانچنے اور پاس کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ ان کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اگر برابر بیٹھا ہوا امیدوار ادب کے پرچے میں بطخ بنا رہا ہے تو جدیدیہ بھی بطخ بنا دے گا۔ اگر پڑوسی بڑے اعتماد سے غلط جواب نقل کر رہا ہو تو یہ بھی نقل کر دے گا۔

ترقی پسند نقل اسے کہتے ہیں جس میں صرف کن انکھیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ آس پاس جو امیدوار ذرا تیز نظر آیا اس کو حرف بہ حرف اتار لیا۔ یا ہر سوال شروع کرنے سے پہلے باتھ روم کا رُخ کیا۔ نیفے سے کتاب، کاپی، گیس پیپر، گولڈن پاسپورٹ وغیرہ نکال کر مطلوبہ صفحہ پھاڑ کر واپسی میں رومال کے نیچے رکھ کر اپنے یا صاحبِ کتاب کے الفاظ میں جواب دے مارا۔

نقل کے اس گئے گزرے زمانے میں جب اسے آرٹ سمجھا جاتا تھا۔ چھوٹی موٹی نقل تو لڑکیاں بھی کر لیتی تھیں۔ ایک چشم دید واقعہ سنئے:

ایک گرلس کالج میں ایک گرل امتحان دینے خود گئی۔ اس کی ساڑی پر بھارت ورش کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ دوسری کے جمپر پر سلسلہ کوہ تھا۔ (جس کی علاحدہ سے چنداں ضرورت نہ تھی) اناڑی ہونے کی وجہ سے دونوں پکڑی گئیں۔ ساڑی والی کا جغرافیہ اور پہاڑیوں والی کا ڈرائنگ کا امتحان تھا۔ امتحان لینے والی ظالمہ نے دونوں کے کپڑے اُتروالئے۔ یہ خبر بد سن کر ہمارے

دوست گرو گھنٹال کے منہ میں پہلے تو پانی بھر آیا کہ افسوس وہ اس وقت کہاں تھے؟ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ "نمائش کے شوق میں افسوس لڑکیاں کسی بھی چیز کو راز میں نہیں رکھ سکتیں۔ ارے، کیا تو میں نے بھی یہی تھا مگر ڈسک پر نقل کے بعد رومال سے ڈسک صاف کر کے نقشہ اس طرح غائب کر دیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

اتفاقاً دوسرے دن ممتحن نے ان کے نقل کے سینگ، برابر کر کے عورت مرد میں مساوات بحال کر دی۔

انہی کی طرح ابتدا میں گرو گھنٹال بھی اناڑی تھے۔ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ زندگی میں مسلسل ناکام رہنے اور ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے کہیں وہ پہلے لیڈر اور پھر وزیر بے تدبیر نہ ہو جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ دودھ کے دُھلے تھے۔ نقل اتنی ہی کرتے جتنی دال میں نمک۔ نمک میں دال کا نمبر تو بہت بعد میں آیا۔ ایک گڑبڑ یہ بھی کہ وہ نہ صرف پڑھتے تھے بلکہ رٹتے تھے۔ امتحان میں آئے والا شرطیہ سوال اگر رٹائی سے رہ جاتا تو چھوٹی سی پرچی پر لکھ کر اس کا تعویذ گھڑی کے پٹے میں چھپا لیتے۔ اگر اس میں سے کچھ آجاتا تو نقل کے ارادے سے مٹھی میں داب کر تھر تھر کانپتے کہ بس اب پکڑے گئے۔ اور ...... نقل کی ٹوہ میں رہنے والے ممتحن کے بیل کی طرح لال لال دیدے انہیں گھورتے، کمرۂ امتحان ناچتا نظر آتا۔ یہی لیل و نہار گرو گھنٹال کے تھے۔ جو اپنے زمانہ میں چوری چھپے نقل کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ممتحن بھی کاپی شناس بلکہ چہرہ شناس ہوتے۔ کاپی کے بجائے طلبائے کے چہرے دیکھ کر بھانپ لیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس ماشدنی سوال کے ساتھ دوسرے سوالوں کے جواب بھی دماغ سے غائب ہو جاتے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا۔ یہاں تک کہ وہ پرچہ چپکے سے پھینک دیتے۔ پسینہ پونچھتے اپنی جیبی سے پانی پیتے۔ پھولی ہوئی سانس دل، دماغ اور نروس بریک ڈاؤن پر قابو پاتے۔ اور اگلے سوالوں

کے جواب میں کاپی چھینے جانے تک کھو جاتے۔

وہ ان کا بچپنا تھا۔ بچوں پر ماسٹروں کی گرفت بڑی سخت تھی۔ اس زمانے کے استاد اصلی گھی اور تازہ ہوا کھاتے، ڈنڈ پیلتے، مگدر ہلاتے، پہلوانی کرتے۔ دس بیس میل پیدل مارچ کرتے۔ لڑکوں کو اسکول میں پڑھانے کے لیے گھر پر پڑھتے۔ لاٹھی گھماتے ہوئے کلاس میں داخل ہوتے۔ ہوم ورک دیکھنے کے بہانے ایک ایک کا بھُرکس نکال دیتے۔ گھنٹہ بھر تک سب کا ملیدہ بناتے رہتے۔ کوئی کونے میں منہ کیے کھڑا ہے۔ کچھ مُرغا بنے ہوئے ہیں۔ کسی کو بچھو یا پری بنایا جا رہا ہے۔ کوئی کلاس سے نکال دیا گیا ہے۔ کوئی ایک ٹانگ سے کھڑا ہے اور کوئی بنچ پر۔ ایسے انگریزی آمرانہ ماحول میں کھلم کھلا نقل یا استاد بہادر کے سامنے سر اُٹھانے کا سرے سے سوال ہی نہ تھا۔ نقل کے شبہے تک میں لڑکے کو اسکول کے باہر کر دیا جاتا۔

اس زمانے میں وطن عزیز پر بادشاہوں کے بادشاہ شہنشاہ مولا بخش کا ڈنڈا راج تھا۔ استاد سے کچھ پوچھنا موت کو دعوت دینا تھا۔ کیوں کہ وہ سب کچھ پڑھا اور آپ پڑھ چکے ہوتے۔ نقل کی آزمائش سے گزرنا دریائے شور یا حبس دوام کو بھگتنے کے برابر تھا۔ ماسٹروں کی عزت و احترام، قدر و منزلت اتنی تھی کہ گھر کے براہ راست بزرگ تک انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے اور نالائق اولاد کے سلسلے میں برسرِ محفل ڈانٹ کھانے میں فخر محسوس کرتے۔ اس زمانے درجہ میں اتنی زیادہ پڑھائی ہوتی، اتنا زیادہ پڑھایا جاتا کہ گھر پر ٹیوشن استاد کے لیے کسرِ شان اور شاگرد کی کند ذہنی سمجھی جاتی۔ استاد بجائے شاگرد سے روپے پیسے کا طالب ہونے کے اپنا سب کچھ شاگردوں پر لٹاتے رہتے۔ اس لیے اسکول ماسٹر اور سالانہ امتحان کے نام سے سارے سال اچھے اچھوں کی روح قسطوں میں قبض ہوتی رہتی۔ پڑھنے کے لیے لوگوں کو جگانا نہیں پڑتا۔ بلکہ لڑکے گھر کے بڑے بوڑھوں سے پوچھتے آپ کو کس وقت جگا دیا

جائے۔ عشا، تہجد یا فجر کے وقت؟ دورِ غلامی میں طالب علم ایسے عابد شب بیدار ہوتے تب ہی قرآن کریم کے علاوہ چکرورتی ڈکشنری اور آمدنامے کے بھی حافظ ہو پاتے۔

اس زمانے کے طلبا، ہتھیلی پر سرسوں جما لیتے۔ یعنی پورے پورے جواب، ہتھیلی پر لکھ کر کاپی بھر آتے۔ باتھ روم کے بہانے جوتے سے سوال حل کرتے۔ ٹھاٹھ سے مونچھوں پر مجاور ے کی حد تک تاؤ دے کر واپس ہو جاتے۔

اس زمانے ہی میں گرد گھنٹال کے جوتے سے دھڑا دھڑ سوال نکلتے، جواب نکلتے۔ مگر جوتا پیر کا پیر ہی میں رہتا نہ کہ اس زمانے کے اناڑی کے خالی خولی جوتا نکالنے کی گستاخی کے باوجود سوال کے جواب تک نقل نہ کر پاتے۔

ہمارے بچپن کے زمانے کے کمالات ملاحظہ ہوں۔ گرد گھنٹال نے "نباتات" کے امتحان میں جاتے وقت اپنے کوٹ پر سات قسم کے پھول لگائے اور ٹھاٹھ سے نقل کر لی۔ ماسٹر صاحب کی اس وقت سمجھ میں آیا جب وہ رخصت ہونے لگے۔ ان کے کوٹ پر نظر پڑتے ہی غضب ناک ہو کر بولے۔

"میاں صاحب زادے! کل "حیوانات" کا امتحان ہے۔ اگر کسی جانور کو کوٹ میں چھپا کر لاؤ گے تو درجہ سے نکال باہر کروں گا۔"

ایک دفعہ کاپیاں جانچنے پر نقل کے شبہے میں استاد نے پوچھا۔

"بچو! کتے پر تم نے جو مضمون لکھا ہے وہ حرف بہ حرف سب کا ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

گرد گھنٹال جو کلاس کے مانیٹر بھی تھے۔ بڑی معصومیت سے بولے۔

"جناب عالی! وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے اسکول کے کتے پر مضمون لکھا ہے۔ اسکول میں

صرف ایک ہی کتا ہے۔"

ایک دفعہ "فٹ بال میچ" پر کلاس میں مضمون لکھنے کے لیے دیا گیا۔ سب لڑکے مضمون لکھنے میں مصروف اور ماسٹر صاحب سروں پر موجود تھے۔ نقل کی گنجایش نہ تھی۔ اس لئے گرد گھنٹال چند الفاظ لکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُستاد نے پوچھا۔

"میاں مضمون کیوں نہیں لکھ رہے ہو تم۔؟" کاپی آگے بڑھاتے ہوئے بولے ـــ

"لکھ چکا۔" ماسٹر صاحب نے دیکھا، کاپی پر لکھا تھا ـــ

"فٹ بال میچ"

بارش شروع ہو گئی اس لیے میچ نہ ہو سکا۔"

ایک دفعہ نقل کرنے میں گرد گھنٹال دھر لئے گئے۔ ممتحن نے خفا ہو کر پوچھا ـــ "یہ کیا ہو رہا ہے؟" انھوں نے ڈھٹائی سے جواب دیا ـــ "وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔"

ماسٹر صاحب نے بلاٹنگ پیپر پانی میں ڈبو کر ان کی کاپی پر پھیر دیا۔ کری کرائی نقل پر پانی پھرتے دیکھ کر انھوں نے پوچھا۔ "آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" ماسٹر صاحب بولے ـــ "وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں!"

خیر اس موقع پر وہ زیر ہو گئے۔ کیوں کہ زبر ہونے کا موقع زبر ہو کر وہ کھو چکے تھے۔ ذرا سی غلطی سے زیر بنا دیئے جانے سے اس سلوک کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا جو دھوبی اپنے گدھے کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ ایک دفعہ گرد گھنٹال نے کمال ہی کر دیا۔

کلاس میں آخری لیکچر دیتے ہوئے استاد نے کہا۔

"لڑکو! شاباش! خوب محنت کرو۔ امتحان سر پر ہے پرچے پریس میں چھپنے جا چکے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لے۔"

گرد گھنٹال نے ایک کو سنے سے کہا۔ "مجھے یہ پوچھنا ہے کہ پرچے آخر کس پریس میں چھپ رہے ہیں؟"

پہلے نقل کا شمار آرٹ میں تھا۔ گرد گھنٹال ٹھیرے آرٹسٹ، ہمیشہ دماغ لڑا کر ایسی تگڑم کرتے کہ بالکل ہی نئے فارمولے سے نقل کی صورت پیدا کر لیتے۔ وہ پڑھتے بھی اور نقل بھی کرتے۔ غرض ملا جلا کاروبار چلائے جاتے۔ بس پڑھنا انہیں اس لیے پڑتا کہ درجے میں پڑھائی ہوتی۔

اُستاد آج کل کے ٹیچروں کی طرح نہیں تھے کہ صرف ٹیوشن اور کوچنگ کرتے اور کلاس میں ٹیوشن پھانسنے آتے ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا پڑھائی میں تیز بھی ہو تب بھی پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اس رئیس کے بچے نے غریب ٹیچر کا حق مارنے کی کوشش کی۔ اسی غلط رجحان کے خلاف گرد گھنٹال لوگ نقل کے ذریعہ جنگ کر رہے ہیں اور دوستوں کی خاطر پیپر آؤٹ کرا رہے ہیں۔

نقل کا ریکارڈ گرد گھنٹال نے اس وقت توڑ دیا جب انہوں نے پنسل سے ڈسک پر ٹیلی گرافی اشاروں کی مدد سے امتحان میں نقل کی۔ کہیں امتحان کے بعد ایک تار بابو کے بتانے پر نگراں صاحب کو یہ راز معلوم ہو سکا کہ وہ بذریعہ تار نقل کر رہے تھے۔ اس زمانے میں نقل کے بہانے لڑکے پورا کورس دُہرا ڈالتے۔ اسی لیے فیل ہونے والا طالب علم بھی پڑھے لکھوں میں شمار ہوتا اور نالائق کی قابلیت کی مثال دی جاتی۔

"کوئی ایسے ویسے تھوڑی میٹرک بلکڈ ہیں ———— کوئی گرے پڑے نہیں۔ آخر مڈل فیل ہیں۔"

گرد گھنٹال کی نقل کا زبردست کارنامہ جس سے ان کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ اس میں

ایک تو ان کا شارٹ ہینڈ کی مدد سے نقل کرنا تھا۔ کوئی بھی ممتحن انہیں اس لیے نہ پکڑ سکا کہ وہ صرف لانگ ہینڈ جانتے تھے۔

جب نقل کے سارے فن استادوں کو اسی طرح معلوم ہو گئے جیسے ہمیں اپنی خوبیاں اور دوسروں کی کمزوریاں تو آخر میں پیپر آؤٹ کرانے کا منافع بخش دھندہ خود انھوں نے سنبھال لیا۔ جس کی وجہ سے نقل کا فن پھر آرٹ سے سائنس ہو گیا۔ اور محکمہ تعلیمات امتحانوں کی تجربہ گاہ بن گیا۔ آخر سائنس نام ہی تجربے کا ہے۔ اساتذہ نے پورے پورے سینٹر کو نقل کرا دینے اور آپس میں ایک دوسرے سے سفارش کر کے سب کو پاس کرا دینے کا کامیاب تجربہ کر دکھایا۔

گرو گھنٹال نے ایک امتحان کبوتر کے ذریعہ بھی پاس کیا تھا اور کالج کے طالب علم کہلائے جانے کے مستحق قرار دیئے گئے تھے۔

بغل میں کبوتر دبائے امتحان ہال میں پہنچے۔ پیپر ملتے ہی اس کے گلے میں باندھ کر اُڑا دیا تھوڑی دیر میں وہ پوری کاپی جس پر سب سوال حل تھے لے آیا اور وہ نقل میں سینٹ پرسینٹ کامیاب ہو گئے۔

ایک کبوتر باز لڑکے نے دوسرے دن ان کی نقل کی کوشش کی مگر بقول شاعر ؎

گھات میں بلی ہے جب اور گارڈ اپنی چال میں

کس طرح لے جائے پرچہ اب کبوتر ہال میں

ممتحن چوکنا تھا۔ مقابلے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ ابھی لڑکا جواب بھی نہ لے پایا تھا کہ ممتحن کی بلی نے اُچک کر کبوتر کو دبوچ لیا۔

یہ اس زمانے کے قصے ہیں جب امتحان میں نقل ہوتی تھی۔ جواب اصلیت سے زیادہ لطیفے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں امتحان میں نقل نہیں بلکہ نقل میں امتحان بلکہ نقل کا امتحان

ہوتا ہے۔ جس کے عبرت ناک مناظر آپ بھی دیدۂ عبرت نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہائی اسکول کے امتحان کا ایک سینٹر چاروں طرف سے پولیس کا سخت محاصرہ۔ سرپرست، والدین اور افسر اپنے بیٹے، بیٹیوں کو نقل کرانے کے لیے بے تاب، دبے چین۔ سامنے سڑک پر، گلیوں میں دوکانوں اور مکانوں کے برآمدوں میں، فٹ پاتھ پر جا بجا نقل کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ امتحان شروع نہیں ہوا کہ امتحان کا پرچہ سینٹر سے بیس، پچیس روپیہ میں خرید لایا گیا۔ پہلے فی سوال پانچ روپیہ بکا پھر بڑی تعداد میں اس کے غلط جوابات بڑی محنت سے بوجھ بجھکڑوں نے "گولڈن کی ایزی پاسپورٹ اور شیور سکسز" کی مدد سے نقل لیے۔ ہر سوال کے جواب میں کاربن کی فوج لگی۔ نقلیں تیار ہوئیں تو خریدار ٹوٹ پڑے۔ نوٹوں کی بارش ہوئی۔ ہر جانب محاصرہ یلغار ہوئی۔ ہر جواب پر رول نمبر، سیٹ نمبر اور کمرہ نمبر لکھ کر جاں باز سپاہیوں کو پیش کیے گئے۔ وہ ایک روپیہ فی جواب اور ایک ساتھ دس جواب سے کم لینے پر تیار نہ ہوئے۔ وقت اتنا محدود کہ مول بھاؤ کی گنجائش نہیں۔ غرض ایک روپیہ والوں کی بھیڑ کم ہوئی تو اٹھنّی والوں کی سنی گئی۔ غریب غربا نے بغاوت کی کوشش کی تو قانون شکنی کے الزام میں دھر لیے گئے۔

ایک طرف تو اتنا چوکی پہرہ، قاعدہ قانون، دوسری طرف بڑے لوگوں اور افسروں کے لیے ہیڈ ماسٹر سے چپراسی تک کلاس کلاس مارے مارے پھر رہے تھے۔ "بھئی رول نمبر.... ....آخر اپنا گڈو ہے ...... صاحب کا صاحب زادہ ہے ...... کی صاحب زادی ہیں۔ ان کا کوئی سوال غلط نہ ہونے پائے۔ مگر سب سے زیادہ باقاعدگی ہائی اسکول کے سکریٹری صاحب کی لڑکی کے سلسلے میں برتی گئی۔ جس مضمون کا امتحان ہوتا اس کا پڑھانے والا ماسٹر ایک ایک سوال ٹھیک حل کرتا۔ اس مضمون کے ماہرین کا بورڈ اسے پاس کرتا پھر جواب

خود ہیڈ ماسٹر دیکھ کر پاس کرتے۔ اس کے بعد امتحان کی کاپی پر خوش نویس اسے نقل کر دیتا۔ اس کے بعد کوئی ماسٹر اس نقل کا پروف درست کرتے۔ جب پوچھے جانے والے سارے سوال حل ہو جاتے تو سکریٹری کی لڑکی جو اس دوران اپنی کاپی پر اپنی سہیلی کو خط لکھ رہی ہوتی، اس کی کاپی بدل دی جاتی اور وہ کاپی جمع کر کے واپس چلی جاتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورے اسکول نے ہیڈ ماسٹر کی ایڑی سے ماسٹر کی چوٹی تک کا زور لگا دیا مگر وہ بدنصیب "گریس" ملنے کے بعد بھی تھرڈ پاس ہو سکی۔ جس سے اس کی جہالت سے زیادہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ماسٹروں کی مجموعی قابلیت پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ تو تجربات ہوئے اسکول کے، اب ذرا کسی کالج یا اس کی یونیورسٹی میں جھانکئے۔

غریب لیکچرار، ڈرتا، کانپتا، لرزتا، تھرتھراتا، آیۃ الکرسی اور کلمہ شہادت پڑھتا کاپیاں اور پیپر لئے کلاس میں داخل ہوا ادھر گھنٹہ بجا، کاپی پیپر بٹا ادھر شروع ہو گیا نقل کا امتحان۔ ہر ایک کتابیں، کاپیاں کھولے اطمینان سے نقل کر رہا ہے۔ ایک دوسرے سے باآواز بلند پوچھ رہا ہے۔ طریقہ جواب پر صلاح و مشورے کر رہا ہے۔ متعلقہ لیکچرار کو جواب لکھانے کے لیے طلب کر رہا ہے۔ ممتحن دروازے کے باہر بلی کی طرح دبا سہما ناول پڑھ رہا ہے۔ پرنسپل، آبزرور یا فلائنگ اسکواڈ اگر نازل ہوں تو ممتحن کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ کھانس کر ہر بشر کو اس کی موت سے آگاہ کر دے۔ ڈسک پر کوئی چھرا گاڑے کوئی رومال میں پستول رکھے۔ ایک بورا یا ٹوکرا کتابوں، کاپیوں اور ایک درجن دوستوں کی مدد سے مصروف امتحان ہے۔ ممتحن کی کیا مجال جو دم بھی مار سکے۔ اگر "پروفیسروں" نے نقل رکوانے کی کوشش کی یا سختی کا ارادہ کیا تو سعادت مند طلبا نے ٹھونک ٹھانک دیا۔ افسر اور پولیس خاموش تماشائی بنے رہے۔ کہ اگر نقل پر پابندی ہو گی تو ان کے بھیا بھتیجے پاس کیسے ہوں گے۔؟ دھول جھاڑنے کے بعد اساتذہ نے امتحان کا بائیکاٹ کر دیا۔ افسروں اور پولیس والوں کی پھر بن آئی۔ انہوں نے امتحان دلوانے کی ذمہ داری

انتہائی غیر ذمہ داری کے ساتھ سنبھال لی اور کالج کی اینٹ سے اینٹ بجنے یا عمارت کو بم سے اُڑا دینے سے بچا لیا۔ نقل کے وارے نیارے ہو گئے۔

اس کے بعد تحریک شروع ہوئی کہ بلا امتحان کے پروموشن دیا جائے جس کے نتیجے میں نقل کے حق کی تحریک زور پکڑ گئی۔ بلا امتحان کے درجہ ملنے سے پرواز میں کوتاہی کا شکوہ کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس سے نقل کی موت واقع ہو جائے گی جو انسان کا پیدائشی حق ہے۔

ہمارا ماہرانہ مشورہ ہے کہ بلا امتحان دئے درجہ حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہوگا کہ امتحان نقل ہی کا ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد لڑکے اور لڑکیاں نقل کی ضد میں پڑھنا لکھنا شروع کر دیں گے۔ اور اس قابل تو ہو ہی جائیں گے کہ کم از کم امتحان میں نقل کر سکیں۔ شاید آپ بھی یہی پسند کریں کہ امتحان ہوتے رہیں خواہ ان کی شکل کچھ بھی ہو۔ اور سارے معاملے کو اس سے سمجھ لیں جو میں نے آپ کو نقل کر دیا ہے۔

——— ❖ ———

لالہ تونڈومل نے جب میرا تقرر بہ حیثیت پرائیویٹ سکریٹری کے کیا تو انھوں نے ہدایت کی کہ "میں فوراً عہدے کا چارج لے لوں"۔ چنانچہ میں نے اس دفتر کا جائزہ لینا شروع کیا جس پر "پرائیوٹ سکریٹری" کی تختی چمک رہی تھی۔

سب سے پہلے میری نظر ایک الماری پر پڑی جو مقفل تھی اور جس پر "ڈینجر" (خطرہ) لکھا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بہت ڈرتے ڈرتے کھولا۔ میرا خیال تھا کہ الماری کے اندر اس عمارت کا بجلی کا میٹر یا آتش گیر مادہ ہوگا۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ الماری میں کبوتروں کی کابک کی طرح خانے بنے ہوئے ہیں اور ہر خانے میں ایک لپٹا لپٹایا ڈنڈا اور ایک بستہ رکھا ہے۔ ایک ڈنڈا میں نے ڈرتے ڈرتے اُٹھایا کہ کہیں "باندھ لے رسّی، مار بے ڈنڈے" قسم کا جادوئی ڈنڈا نہ ہو اور مجھے خواہ مخواہ میں اُدھیڑ کر رکھ دے۔

دیکھا تو وہ ڈنڈا نہیں بلکہ کوچوان کی چابک کے قسم کی ایک عدد بانس کی چھڑی تھی جس پر ایک کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ میں نے کپڑا کھولا تو وہ بجائے محض ایک معمولی کپڑے کے "کنگ ریسی پارٹی" کا باقاعدہ جھنڈا تھا۔ اس کے بعد بستہ اُٹھا کر دیکھا تو اس میں اس پارٹی کے ممبروں اور حمایتیوں

کی تفصیلات، پارٹی کی پالیسی، پارٹی کے سرپرستوں اور ان اداروں کی تفصیلات تھیں جہاں سے چندہ، کوٹہ، پرمٹ اور لائسنس وغیرہ مل سکتے تھے۔ اور دوسری مفید معلومات درج تھیں جن کا بیان کرنا مفادِ عامہ کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ اس کے بعد میں نے دوسرا ڈنڈا اٹھایا اس میں "چھومنتر پارٹی" کا جھنڈا نکلا۔ تیسرے ڈنڈے میں "جھنجھٹ سنگھ" کا جھنڈا تھا۔

غرض اسی طرح ہر خانے میں کسی نہ کسی پارٹی کا جھنڈا اور اس کے بارے میں مکمل تفصیلات محفوظ تھیں۔ ایک خانہ خالی تھا۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ "خانہٗ خالی را دیو می گیرد" یعنی اسی خانہ خراب میں آج کل لالہ توندومل ہوں گے۔ آفس ٹیبل پر جو ٹیبل لیمپ رکھا تھا وہ مثل ایک جھونپڑی کے تھا اور جس پر جھونپڑی پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اسی پارٹی سے متعلق میز پر فائلیں اور رجسٹر وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد طلبی ہوئی، لالہ توندومل نے مجھے اُن تمام فرائض سے آگاہ کیا جو مجھے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے انجام دینا تھے۔ مثلاً ریڈیو اور اخبار کی اہم خبروں سے باخبر رکھنا، ہر اہم مسئلے پر ان کی جانب سے بیانات جاری کرنا، جن کاروبار میں ان کا سرمایہ لگا ہوا تھا ان سے متعلق بازار بھاؤ سے باخبر رکھنا، ریاستی اور ملکی سیاسی صورت حال پر گہری نظر رکھنا۔

لالہ توندومل ریاست کے ممتاز سیاسی اور سماجی رہنما اور "جھونپڑی" پارٹی کے اہم لیڈروں میں تھے۔

چوں کہ ضمنی انتخاب قریب تھا اس لئے لالہ توندومل کا دربارِ عام صبح تڑکے لگ جاتا۔ طریقۂ کار کے مطابق ہر ضرورت مند کے لئے کسی وزیر یا بہت بڑے سرکاری افسر کو وہ کھٹ سے فون کر دیتے۔ اور اس کے ساتھ بغل والے کمرے میں سے جہاں فون کیا گیا تھا، فون پر مطلع کر دیتا کہ "مجبوراً فون کیا گیا تھا لوگ سفارش کے لئے بالکل مجبور کر دیتے ہیں مگر آپ کچھ خیال نہ کیجے گا۔"

لالہ تو ندو مل کی ہدایت تھی کہ ہر پارٹی کے لیڈروں کی یکساں طور پر خاطر کی جائے۔ پالیسی میں لاکھ اختلاف سہی مگر ہیں تو ہم سب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے۔ اِس کوٹھی کا دھان اُس کوٹھی میں اور اُس کوٹھی کا دھان اِس کوٹھی میں کرنے کا دوسرا نام سیاست ہے۔ ورنہ سب چلتا ہے۔ ہمیں آم کھانے سے مطلب گٹھلیاں گننے سے فائدہ؟"

ایک دن مجھے بلا کر انہوں نے راز داری سے کہا "میں پارٹی بدلنا چاہتا ہوں۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس سے فائدہ؟" انہوں نے کہا۔

"فائدہ! فائدہ صاف ظاہر ہے۔ علیحدہ پارٹی بنانے سے کہیں آسان پارٹی بدلنا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ پارٹی کیسے بدلتے ہیں؟" اُنہوں نے کہا۔

"جیسے دھوتی بدلتا ہوں، کُرتا بدلتا ہوں اور جُوتا بدلتا ہوں بالکل اسی طرح پارٹی بدلتا ہوں۔" عرض کیا۔

"مگر دُنیا کیا کہے گی؟" بولے۔

وہ زمانے لد گئے جب پارٹی بدلنے پر لوگ کہا سُنا کرتے تھے۔ اب تو پارٹی نہ بدلنے پر اُنگلیاں اُٹھنے لگتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"اس سے آپ کو کیا ملے گا؟" بولے۔

"ملنے کو تو وزارت تک مل سکتی ہے۔ مگر برسر اقتدار پارٹی کے ساتھ رہنا کون سی وزارت سے کم ہوتا ہے۔ بس مجھو سیاں بھئے کوتوال والا معاملہ رہتا ہے۔"

اس کے بعد میں خاموش ہو گیا اور لالہ تو ندو مل راتا راتی "جھونپڑی" پارٹی سے

"تاراچھاپ" پارٹی میں شامل ہو گئے۔ اور میری میز پر جھونپڑی والے لیمپ کی جگہ ستارہ نما برقی لیمپ جگمگانے لگا۔ جھونپڑی پارٹی کا جھنڈا اور فائل داخلِ دفتر ہو گئے اور تاراچھاپ ڈنڈا اور فائل نکل آئی۔ چپراسی کی وردی بھی لال سے نیلی ہو گئی۔ یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا جیسے مکان تیاری کے بعد از سرِ نو سجا دیا جاتا ہے۔

تاراچھاپ ہونے کے بعد لالہ توندومل واقعی آسمان کا تارا ہو گئے۔ موٹر کا ماڈل بدلا، بینک بیلنس بدلا، حالات بدلے اور نئے کاروبار کے ساتھ خود بھی چمکنے لگے۔

ان سے ہونے والی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اگر انہوں نے دو تین پارٹیاں اور بدل لیں تو بہت جلد یہ ممبر سے وزیر ہو جائیں گے۔

ہوا بھی یہی کہ انہوں نے "تاراچھاپ" سے "جھنجھٹ چھاپ" اور پھر "شیر چھاپ" پارٹی میں تابڑ توڑ کئی جست لگائیں تو ایک دم ممبر سے وزیر باتدبیر ہو گئے۔ میں اتفاق سے اس مبارک موقع پر چھٹی پر تھا۔ مبارک باد دینے پہونچا تو انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا کہ "مبارک باد کی ضرورت نہیں جلدی سے "شیر چھاپ" پارٹی کے تمام کاغذات وغیرہ مقفل کر دیجئے۔ وزارت راس نہیں آئی۔ دوسری پارٹی نے ہماری پارٹی سے ممبر اتنے زیادہ توڑ لئے کہ شام تک دوسری پارٹی برسرِ اقتدار آ جائے گی۔"

کچھ راز و نیاز کے بعد میں نے جلدی جلدی کاغذات غائب کر کے نئی پارٹی کی شان میں ایک قصیدہ اور پرانی پارٹی پر الزامات کی طویل فہرست بیان کی شکل میں لالہ توندومل کے سامنے پیش کر دی۔

جسے پڑھ کر لالہ توندومل پھڑک اٹھے اور ٹیلی فون پر اپنی کابینہ کے ساتھی زمانہ ساز خاں کو دونوں بیان سنائے۔ زمانہ ساز خاں سے بات چیت کے بعد وہ بولے۔ "احتیاطاً ایک

بالکل اس کے برعکس بیان تیار کر دیجئے تاکہ اگر حالات مزید پلٹا کھا جائیں تو اپنے پہلے بیان کی بروقت تردید بھی کی جا سکے۔

بہت غور و خوض کے بعد لالہ جی نے رات گئے اخباروں میں اشاعت کے لئے دونوں بیانات ایک ساتھ جاری کر دیئے۔ اور ہنستے ہوئے بولے "سکریٹری صاحب! اس کو کہتے ہیں دو گھوڑوں کی سواری"۔

دوسرے دن وزارت بدل گئی مگر لالہ جی بدستور وزیر رہے۔ جو لوگ کل مبارک باد دینے آئے تھے انہوں نے آج لالہ جی کی کوٹھی کے سامنے مظاہرہ کیا اور جو لوگ کل مظاہرہ کر گئے تھے انہوں نے آج مبارکباد پیش کی۔ لالہ تو ندومل نے دونوں کی تواضع کی اور کہا "آپ لوگ تو روز کے آنے والے ہیں۔ غریب خانے کو رونق بخشتی ہے تو کچھ جل پان بھی کرتے جائیے"۔

ایک دن لالہ تو ندومل کو "ہندی تحریک" کا افتتاح کرنے جانا تھا مگر موٹر بچوں کو لینے "کانوینٹ" گئی ہوئی تھی۔ کار کے انتظار میں بے تابی سے ٹہل رہے تھے کہ اچانک میرے کان میں اپنا منہ تقریباً داخل کرتے ہوئے آہستہ سے بولے۔ "سکریٹری صاحب میری سمجھ میں ایک تجویز آئی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ کی سمجھ میں کون سی تجویز آئی ہے؟" وہ بولے۔

"بھئی اس آیا رام اور گیا رام سے میں بھی عاجز ہو گیا ہوں اس لئے ایک ایسی پارٹی بنانا چاہتا ہوں جس کی ہر صورت اور ہر حال میں حکومت رہے۔ میرا مطلب حکومتیں بدلتی رہیں مگر ہماری پارٹی برسر اقتدار رہے"۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ کس طرح ممکن ہے؟" بولے۔

"ارے یہ تو بہت ہی آسان ہے۔ وہ تمام ممبران اسمبلی جو پارٹیاں بہت پابندی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی ایوان میں اکثریت ہے۔ یہ جس طرف چلے جاتے ہیں اسی طرف حکومت بھی لڑھک جاتی ہے۔ اس لئے ان کی اگر ایک الگ پارٹی بن ئی جائے تو ہماری پوزیشن بہت ہی مستحکم ہوجائے گی۔" میں نے پوچھا۔

"اس کا نام کیا رکھا جائے گا؟" انہوں نے کہا۔

"اس کا نام ہم "دل بدلی ورِھائیک دَل" (پارٹی بدل متحدہ محاذ) رکھیں گے۔"

نام ہمیں بہت پسند آیا۔ اسی دن نئی پارٹی وجود میں آگئی۔ اور اس کا انتخابی نشان "گرگٹ" قرار پایا۔ تب سے اسی پارٹی کی حکومت چل رہی ہے۔ پارٹیاں آتی جاتی رہتی ہیں مگر وزارت جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔

نئی پارٹی بنانے کے بعد لالہ توندومل کی متضاد سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع اور دلچسپ ہوگیا مگر جب سے نشہ بندی کی تحریک میں انہوں نے دلچسپی لینا شروع کی زیادہ بہکنے لگے ہیں۔

یوں تو وہ ضرورت کے تحت اطمینان سے فرقہ وارانہ فساد کرادیں گے۔ اس کے بعد فسادیوں پر فائرنگ بھی کرادیں گے پھر فائرنگ کرنے والوں کے خلاف تحقیقات بھی شروع کرادیں گے۔ غرض کیا مجال کہ روزی، روٹی، مکان، مہنگائی، چور بازاری، منافع خوری یا ذخیرہ اندوزی کے خلاف کوئی چوں بھی کر سکے۔ اِدھر آپ نے مہنگائی کے خلاف نعرہ لگایا، اُدھر انہوں نے کھٹ سے "مینڈھا نہیں کٹ سکتا" تحریک چلادی اور سب مہنگائی بھول کر مینڈھے بچانے کے بجائے آپس میں مینڈھوں کی طرح لڑنے لگے۔ ادھر کسی پارٹی نے بدعنوانیوں کے خلاف آواز بلند کرنا چاہی اور لالہ صاحب نے "لسانی جھگڑا" کھڑا کر دیا۔ اب معلوم ہوا وہ

پارٹی بے چاری بھی ساری بدعنوانیاں بھول کر لسانی بلوؤں میں اس خوف سے لگ گئی کہ "اگر خاموش رہے تو کہیں پارٹی کے ہاتھ سے پیارے عوام اور ان کے دلارے ووٹ نہ نکل جائیں۔"

لالہ توندمل ہیں بہ حیثیت سیاست داں کے یہ ایک خوبی اتنی بڑی ہے کہ شائد بڑے سے بڑے لیڈر میں نہ ملے کہ ہر پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کو ذرا دیر میں کوئی نہ کوئی بلوہ یا ہنگامہ کرداکے قابو میں لے آتے ہیں اور جب کچھ دن آرام سے حکومت کرنا چاہتے ہیں تو کوئی نہ کوئی تحریک چلوادیتے ہیں۔ چنانچہ انہی ہنگاموں کے ساتھ لالہ توندمل کی ہنگامی پارٹی بھی چل رہی ہے اور ہنگامے بھی چل رہے ہیں۔ اور ہنگامے بھی ایسے جن میں حکومت کم اور دنگا فساد زیادہ۔ اور جب سے انہوں نے اپنی اکثریت بناکر "دل بدلی کے خلاف قانون" بنوا دیا ہے، ان کے بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ اُڑے اُڑے پھرتے ہیں کہ فی الحال تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔

—— ❖ ——

سب سے بڑی ذات بذات

جس طرح سب سے بڑا تالا اللہ تعالیٰ ہے کہ آج تک اس کے اسرار نہ کھل سکے۔ اسی طرح سب سے بڑی ذات، بذات ہے۔

یہ انکشاف ہم پر اس وقت ناگہانی ہوا جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ملک کے تمام شہریوں کو سرکار غلط کار نے مذہب و ملت، کے ساتھ جملہ ۱۲۸ ذاتوں میں تقسیم کردیا ہے۔ سب سے پہلے تو ہم نے احتیاطاً ذات، پات چارٹ بغور دیکھا کہ اس میں ہم کہاں پر فٹ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا ہم نمبر پر۔ اس سے پہلے قسم لے لیجئے، ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم بھی اتنے نمبری ہیں۔

ابھی ہم اسی پریشانی میں تھے کہ ہمارا نمبری ہونا کیا رنگ لائے گا اور اب ہمارا کیا حشر ہوگا۔ ہم ہوں گے اور محشر ہوگا یا صرف حشر رہ جائے گا اور ہم لاپتہ ولامکاں ہوجائیں گے کہ ہمارے محلے کے قومی نیتا شری جٹا دھاری مہاراج تشریف لے آئے۔ جٹا دھاری نیتا بڑی مستعدی اور پابندی سے پارلیمنٹ سے گرام پنچایت تک کا ہر الکشن ہارا کرتے ہیں۔ چٹکی بجاتے ہی بڑے سے بڑے گرہ کٹ کی تھانے سے ضمانت کرادیتے ہیں۔ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے چوروں اور بیانِ نزاعی و چشم دید گواہ ہوتے ہوئے بڑے سے بڑے قاتل اور ڈاکو کو چھڑا لاتے ہیں۔ شہر کے

آدھے بوگس پرمٹ اور جعلی لائسنس انہیں کے بنوائے ہوئے ہیں۔ بقیہ آدھے شہر کا انکم ٹیکس، سیلس ٹیکس اور جانے کون سے ٹیکس بچائے ہوئے ہیں۔ ٹیکس افسر کیا ان کے منہ آئیں گے۔ کلکٹر صاحب بہادر تک کا چہرہ انہیں دیکھ کر اُتر جاتا ہے کہ کمشنر دن تک کے کھڑے کھڑے تبادلے کرا چکے ہیں۔ خود کبھی نہیں جیتے تو کیا ہوا۔ جو حکومت میں گیا اپنے کو ہرا کر گیا۔ نہ یہ ہارتے اور وہ وزیر ہوتا۔ تو بھلا وزیر ان کی نہ سنتے تو کس کی سنتے۔ ان کا کہنا تھا کہ :

"اور تو اور شریمان جی! حکومت تمہاری چلے، میری بس بات چلتی رہے۔"

غرض آتے ہی بولے۔ "اور تو اور شریمان جی! یہ تو بڑا اپرادھ ہے۔ میں ڈاکخانے ٹکٹ لفافے لینے گیا تھا۔ اس بدذات نے میری ذات پوچھی اور بولا "پیچھے کھڑے ہو جاؤ! پیچھے۔ ابھی بہت سے تم سے بھی نیچی ذات والے موجود ہیں۔ بھلا ان سے پہلے تمہیں کیسے ٹکٹ اور لفافے مل جائیں گے۔؟"

پھر وہ تڑپ کر بولے ــــــ

"اور تو اور شریمان جی اب تو سب کو شناختی کارڈ رکھنا پڑا کریں گے۔ اور تو اور سمجھئے "آئی ڈینٹی کارڈ" اور تو اور شریمان جی شامت جو میری آئی تو یہ جو سرکاری بم پولیس بنائے گئے ہیں۔ اور تو اور بڑے زور سے لگ رہا تھا۔ مگر مہتر مہاراج نے مجھے اندر نہیں گھسنے دیا اور بولا "پہلے شناختی کارڈ دکھاؤ تاکہ تمہاری ذات کے مطابق تمہیں پاخانے کی لائن کا نمبر دیا جائے، کوئی لاٹ صاحب کے بچے تھوڑے ہی ہو کہ گری پڑی ذاتوں کو موقع نہ دیا جائے اور تمہیں موقع مل جائے۔"

میں نے کہا۔

"اور تو اور شریمان جی بہت زور سے لگ رہا ہے کہیں ذات پات کے چکر میں نکل نہ جائے۔

"اگر ایسی ہی جلدی ہے تو میدان کر آؤ۔" "اور تو اور شریمان جی میں اس پر بھی تیار ہو گیا اور بولا۔"

"لاؤ لوٹا ــ !" ــ وہ بولا ــ

"لاؤ شناختی کارڈ ــ!"

"اور تو اور شریمان جی میں نے تو خیر گھر پر آ کر دھوتی بدل لی لیکن اور تو اور شریمان جی اب تو سب کو شناختی کارڈ رکھنے پڑیں گے جس نمبر کی ذات ہو گی اسی نمبر پر لائن سے راشن، سینما اور ریلوے وغیرہ کے ٹکٹ ملا کریں گے۔ اور تو اور شریمان جی لونڈوں کو پڑھانا لکھانا بے کار ہے۔ جہاں بھی دو چار آسامی نکلے گی۔ وہاں اور تو اور شریمان جی آنے سے رہا ان کا نمبر اور ہو چکے یہ نوکر ــ !"

شری جٹا دھاری بک جھک کر گئے، تو میں ذاتی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔ جب میں اپنے پڑوسی معین انصاری کے گھر کے قریب پہونچا تو میں نے دیکھا کہ پڑوسی معین انصاری صاحب اپنے لڑکے کو مار مار کر اس کا بھُرکس نکال رہے تھے اور اس کے کان اس طرح اینٹھ رہے تھے جیسے عورتیں آٹا گوندھتی ہیں۔ میں نے انہیں روکتے ہوئے کسی نہ کسی طرح بڑی جدوجہد سے غریب لڑکے کو چھڑایا اور کہا۔

"بھئی فیملی پلاننگ میں زیادہ بچے پیدا کرنے سے منع کیا گیا ہے مگر جو پیدا ہو چکے ہیں انہیں مارنے کے لیے کہیں نہیں کہا گیا ہے۔ پھر آپ آخر کس خوشی میں خونِ ناحق وہ بھی ایک معصوم کا اپنی گردن پر لینے کے لیے اُتارو ہیں۔؟"

معین انصاری صاحب ایک بار پھر اپنے لڑکے کی طرف ارنا بھینسے کی طرح جھپٹے۔ میں نے درمیان میں حائل ہوتے ہوئے کہا۔

"یار! آخر کیوں لڑکے کو مار مار کر بے حیا کئے ڈال رہے ہو؟ اس وقت سے ڈرو جب تمہارا بڑھاپا اور اس کی جوانی ہو گی اور یہ لاٹھی لے کر تمہیں دوڑائے گا۔! ایسا نہ مارو کہ مر ہی

جائے۔"

معین انصاری صاحب اپنے آپے سے باہر، بلکہ باہر کے بھی باہر ہوتے ہوئے اپنے لڑکے کی کاپی ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بپھر کر بولے۔

"بھائی جی! بس دیکھ لو اپنے نالائق بھتیجے کے کرتوت۔ میں اپنے منہ سے کیا کہوں۔؟ اس نے تو سب میرے کئے پر پانی پھیر دیا۔"

میں نے دیکھا۔ لڑکے نے اپنی کاپی پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"سید امین انصاری۔"

میں نے پوچھا۔

"بچہ ہے! اگر لکھ ہی دیا تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

معین انصاری صاحب تلملا کر بولے۔

"خوب! خوب! گویا کچھ ہوتا ہی نہیں۔؟ اور یہ جو اس کمبخت نے اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو "سید" لکھ دیا، تو اب بھلا اس کی فیس کون دے گا؟ آخر اسے نوکری کیسے ملے گی۔ میں نے تو نہ جانے کیسے مر مر کر اپنے آپ کو سید سے انصاری بنایا تھا۔ اور اب یہ پھر سید ہونا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"مگر معین انصاری صاحب۔ یہ تو فور ٹو ٹنٹی ہوئی۔"

وہ بولے۔

"فور ٹو ٹنٹی کا تو صاحب زمانہ ہی ہے۔ آخر وہ ٹھاکر صاحب جن کی مونچھوں پہ چراغ جلتے ہیں بڑے اکڑتے تھے آخر انہوں نے بھی تو اپنے نور نظر کو تیلی لکھا دیا۔ نہ صرف لڑکے نے مفت تعلیم

پانی۔ وظیفہ الگ۔ جھاڑا اور آخر گیانہ ڈپٹی کلکٹری میں ۔ ؟"

یہ کہہ کے معین انصاری نے پھر ڈنڈا اٹھایا۔ بڑی مشکل سے لڑکے سے اس کی کاپی پر سیّد کٹوا کر معاملہ رفع دفع کیا۔

کچھ اور آگے بڑھے تو لالہ کروڑی مل سے ملاقات ہوگئی۔ لالہ جی اسم با مسمیٰ ہیں اور واقعی کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"لالہ کروڑی مل جی! آپ کس ذات سے تعلق رکھتے ہیں؟"

لالہ کروڑی مل نے سر کھجاتے ہوئے کھیس نکال کر کہا۔

"لو خوب پوچھو ہو، ذات بھی کہیں چھپے ہے؟ بھگوان کی دیا سے ہم جنم جنم کے بیک ورڈ ہیں اور اب تو سرکار نے بھی ہمیں بیک ورڈ مان کر ہماری ساری سمسیائیں حل کر دی ہیں۔"

میں یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھا کہ لالہ کروڑی مل بیک ورڈ ہے۔ تو پھر معاشی طور پر آخر فارورڈ کون ہے؟ اتنے میں میرے علاقے کے فاقہ مست، پنڈت برہمانند اور مولوی سید عبدالکریم مل گئے۔ مولوی سیّد عبدالکریم مستند خاندانی شجرے کے مطابق سرخ بخاری سیّد اور خالص سادات میں سے ہیں۔ اور پنڈت کی گوتر کا کیا کہنا۔ پنڈت جی جب کوئی مرتا جیتا۔ شادی بیاہ اگر کبھی کہیں ہوتا تو بے چارے کچھ دان دکشنا پا جاتے۔ ورنہ ان کے گھر بھر کا برت رہتا۔ مولوی مسجد میں محلہ کے بچوں کو پڑھاتے۔ کبھی کسی گھر سے کھانا آجاتا کبھی کسی گھر سے۔ کبھی گول بھی ہو جاتا۔ اور مولوی صاحب کے فاقے ہو جاتے۔ دونوں سے میں نے پوچھا۔

"جناب! آپ دونوں کی ذات؟"

دونوں بولے۔

"جھاڑو پھیرے ذات پات پر! ملک ایک قوم ایک۔ پھر یہ سب ذات پات کیا۔ ہم اعلیٰ

ذات کے ہیں۔ اس لیے بے گھر لوگوں کو جو زمین ملی تو وہ اب ہم سے واپس مانگی جارہی ہے۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میرا دوست، رتن سنگھ مل گیا۔ اسے لاٹری کے ٹکٹ بیچتے دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا" ادے یار رتنا! بادشا ہو' تم تو ریلوے میں انجن ڈرائیور لگے ہوئے تھے۔ لاٹری کے ٹکٹ کیوں بیچ رہے ہو۔؟"

رتن سنگھ بولا۔"یار وہ ہم لوگ جو ہیں تو بڑے خاندانی گرو سنتان ہیں۔ تو ہمارے فارورڈ ہونے پر ہمیں تنزلی دے کر جنتا بہادر نے ہمارے انڈر میں کام کرنے والے ایک بیک ورڈ فائرمین کو انجن ڈرائیور بنادیا۔ اپن تو مونچھ نیچی نہیں ہونے دیتے۔ بس نوکری پر ایک لات ماری اور اپن نیا دھندا چالو کردیا۔ مگر جس نے زندگی میں ایک دن بھی ریل کا انجن نہیں چلایا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن پوری مسافر گاڑی کو سیدھے پرلوک پہونچادیا۔"

رتن سنگھ سے مل کر گھر واپس چلا آیا کہ کہیں مزید چھان بین میں، میری گاڑی بھی خدا گنج نہ پہونچ جائے۔ اور میں نے طے کرلیا کہ اب کبھی ذات پات کے چکر میں نہ پڑوں گا۔ کیوں کہ سب سے بڑی ذات بذات ہے۔

———⁘———
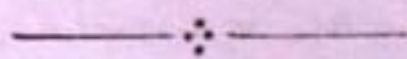
جائیں تو جائیں کہاں

یہ دنیا تو انسانی چوپایوں کی چراگاہ ہے۔ جس میں روزانہ صبح سے رات تک، جنگل عجائب گھر اور سرکس کے بھانت بھانت کے مویشیوں سے ہم ٹکراتے رہتے ہیں۔ اگر آپ نہ بھی ملنا چاہیں تو پڑوسی، رشتے دار اور دوست آپ سے ملاقات کے بہانے ٹکراتے رہیں گے۔

پڑوسی اس فلسفی کو کہتے ہیں جو آپ کے گھر کو اپنا آنگن سمجھے پڑوسی کا سارا عمل چھوٹے زمیندار یا بڑی طاقتوں والا ہوتا ہے۔ آپ سے کون کون ملنے آیا؟ کیا کیا باتیں ہوئیں؟ اصل معاملہ اور معاملے کی تہہ میں کیا ہے؟ آخر آپ کے یہاں پکا کیا ہے؟ غرض وہ ہر بات کی ٹوہ میں رہتا ہے اس کی جاسوسی کا مقصد آپ کو کمزور کرنا اور اپنا ماتحت بنانا ہوتا ہے۔ ادھر آپ نے صبح صبح مرغیاں باہر نکالنے کے لئے دروازہ کھولا اور پڑوسی اندر آ گئے۔ آپ نہانے کا موڈ ہی بناتے رہ گئے کہ وہ غسل خانہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ آپ نہانے گئے تو وہ آپ کا اخبار لے کر دھوپ کھانے بیٹھ گیا۔ آپ دھوپ ابھی نہ کھا پائے کہ وہ آپ کا ناشتہ کھا گیا۔ تیار ہو کر دفتر کے لئے جانے لگے تو اس نے اپنے دس غیر ضروری کام آپ کے سر منڈھ دیئے۔ آپ کے جانے سے پڑوسیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ قطعاً ختم نہ ہو گا۔ اس کی گھر والی آپ کے گھر

میں دن بھر ادُھار اور منگنی کا خوشگوار سلسلہ جاری رکھے گی۔ شام کو جب آپ پڑوسیوں کے کاموں سے بامراد لدے پھندے تھکے تھکائے لوٹیں گے تو پڑوسیوں کو حسب معمول ڈرائینگ روم کو چوپال کی طرح استعمال کرتے ہوئے پائیں گے۔

پڑوسی کی دنیا پڑوسی کا گھر، محلہ کائنات، اور سب سے مفید مشغلہ محلے والوں کو آپس میں لڑانا۔ جس کے لئے وہ ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں جن کے جملہ حقوق ہر قسم کے برساتی لیڈروں کے نام محفوظ ہیں۔ اسی لئے اکثر کامیاب پڑوسی مقامی لیڈر بھی ہو جاتا ہے۔

سب سے مزے میں وہ ہے جو ہر قسم کے پڑوسیوں اور پڑوس سے پاک ہے۔ ہمارے ایک بے حد سنجیدہ دوست کا جب یہاں تبادلہ ہوا تو ایک سے ایک بہتر مکان ملنے کے باوجود انھوں نے ایک مہنگے اور اچھے ہوٹل میں رہنا پسند کیا۔ جب ہم نے ان سے اس بے جا ٹھاٹ باٹ نمود و نمائش بلکہ آرائش و زیبائش کا سبب پوچھا تو بولے "ہوٹل بہت مہنگا ضرور ہے مگر پڑوس اور پڑوسی نہ ہونے کی وجہ سے گھر اور اسپتال سے بے حد سستا پڑتا ہے۔

رشتے داری کے لئے کہا گیا ہے کہ غم داری

غم نہ داری بز بخر

یہاں بکری کی تشبیہ دراصل رشتہ دار کے لئے استعمال کر کے غم کی مرغی نہ سہی غم کی بکری پالنے والوں کو آگاہی دی گئی ہے کہ خبردار اگر تم نے کسی رشتے دار کو پالنے کی کوشش کی تو تمہارا بھی اس دار فانی میں وہی حشر ہوگا جو مرغیاں اور بکریاں پالنے والوں کا ہوا کرتا ہے۔ اور تمہاری جان کو غم کا روگ لگ جائے گا۔

رشتے دار سے نجات ممکن نہیں۔ یہاں پر ہر فارمولا فیل ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر رشتے دار جتنا نزدیکی ہوتا ہے وہ اتنا ہی تکلیف دہ ہوا کرتا ہے۔ رشتے داری دراصل ایک قسم کی نہ ختم ہونے

والی پنچایت ہوا کرتی ہے۔ اس بنیادی جمہوریت میں رشتے دار کی حیثیت آپ کے لئے حزب مخالف کی ہوتی ہے۔ آپ میں کتنی برائیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ یہ تو آپ کے دل سے زیادہ کراماً کاتبین ہی بتا سکتے ہیں مگر معہ مبالغے کے آپ کے رشتے دار ان سے کہیں زیادہ بتاتے بلکہ جتاتے رہتے ہیں۔

پڑوسی سے تو آپ پیچھا چھڑا بھی سکتے ہیں مگر رشتے دار اپنا خون جو ٹھہرا۔ اس لئے خوں خواری ختم ہونے میں نہیں آتی۔ کیونکہ اس کا آپ کا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔

جس طرح فصل پر ٹڈی دل گرتے ہیں۔ اسی طرح رشتے داروں کے نزول کا بھی بارہ ماسی موسم ہوا کرتا ہے۔ اور اس طرح گرتے ہیں جیسے کسی قوم پر عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ دور دراز کے ایک ٹوٹے پھوٹے بزرگ نما خوشحال رشتے دار جن سے رشتہ بھی بہ خوبی واضح نہ ہو سکا، اپنے ایک درجن کھلنڈرے اور بدشوق بچوں کو اسکول میں داخل کرانے کے لئے نازل ہو گئے۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ان کے داخلے بھی ہو گئے۔ ہاسٹل میں جگہ نہ مل سکی اس لئے بچوں کی دیکھ بھال اور ہماری نگرانی کے لئے اگلے سیشن تک بزرگوار رک گئے۔ لگے ہاتھوں ایک معقول مکان کی تلاش کی بھی فرمائش کر دی۔ مگر اس مفت کا چندن گھس بے للو کے مقابلے میں کوئی مکان پسند بھی کیسے آتا؟ ادھر گھر گرہستی کی اینٹ سے اینٹ بج جا رہی ہے۔ بچوں کے فلموں کے جنگلی مناظر فلمانے سے فرنیچر کی چولیں ہلی جا رہی ہیں۔ گھر کباڑ خانہ بن گیا ہے۔ مگر اُف تک نہیں کی جا سکتی کہ رشتے داری دھوئیں کی دیوار کی طرح غائب نہ ہو جائے خدا خدا کر کے یہ فوج گئی تو دوسری بٹالین آ گئی۔ معلوم ہوا کہ رشتے کے پرنانا کی حالت غیر ہے گھر سے اسپتال تک دوڑ دھوپ کے بعد ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اب ان کو دیکھنے کے لئے وہ وہ رشتے دار چلے آ رہے ہیں جنہیں دیکھ کر ہمارا بھی جی خوش ہو جاتا ہے کہ ماشاء اللہ کافی

بڑا خاندان پایا ہے۔ لاکھ مغموم ماحول سہی مگر گھر میں کیا جھل بہل ہے۔ آخر شریف آدمی تھے۔ دم اکھڑنے لگا، سورہ یٰسین پڑھی جانے لگی تو وطن کی مٹی کی فرمائش کردی۔

ابھی ٹھیک سے بھیڑ چھٹی بھی نہیں تھی کہ ایک صاحب، کا تبادلہ ہوگیا۔ خاصی بڑی توپ تھے اور سامان توپ خانہ جب تک بنگلہ الاٹ نہ ہوسکا انھوں نے خانہ انوری کو جگمگائے رکھا۔ ان کی چھوٹی حاضری، منجھلی حاضری اور بڑی حاضری نے ناک میں دم کردیا۔ بقیہ کسر ان کے بلڈاگ نے پوری کردی۔

رشتہ داری میں یہ بتانا ضروری نہیں کہ ادھر خیر سے کسی لڑکی کی شادی پکی ہوئی اور پورا کا پورا خاندان مع شاگرد پیشہ آن دھمکا۔ مہینوں خریداری۔ ڈھولک، سینما، پک نک اور سیر سپاٹوں کا سلسلہ جاری رہتا آخر میں بجٹ فیل ہونے اور اسے عارضی طور پر خسارے سے منافع میں تبدیل کرنے کی براہ راست، ذمہ داری بھی آپ ہی پر پڑے گی۔ پھر رشتے دار کا کھاتہ ہمیشہ سادہ ہی رہتا ہے۔ بلکہ الٹی شکایت ہی رہتی ہے کہ "صاحب آخر آپ کی بھی تو ذمہ داری۔ آپ تو کچھ کرتے ہی نہیں!"

دوستوں میں معاملہ ایک دم صاف ہے۔ جس کو غرض ہوگی آپ اس کی دوستی کا دم بھریں گے۔ اگر آپ کی ہر ممکن امداد سے دوست ترقی کی راہ پر آپ سے کچھ بھی آگے بڑھ گیا، آپ سے اونچا ہوگیا تو بس اس کی صرف ایک ہی پہچان ہے۔ وہ یہ کہ وہ آپ کے خط کا جواب نہ دے گا آپ سے ملاقات کے لئے اس کے پاس وقت ہی نہ رہ جائے گا۔

دوستوں میں سب سے معصوم قسم دانشور ٹائپ کے احباب کی ہوا کرتی ہے۔ دانشور اس زمانے میں اسے کہا جاتا ہے جس میں سوائے دانش کے سب کچھ ہو، کرسی ہو، عہدہ ہو، براہ راست لانڈری سے ڈرائی کلین کی ہوئی نہایت جامہ زیب، موثر نشین شخصیت، ہو حاتم طائی

سے خنجر میں لکھا ہو۔ اس کمی کو وہ اکثر میں لڑ جھگڑ کر بزور بازو پوری کرتا رہتا ہے۔

خیر سے ہمارے ایک شاعر دوست ہیں حضرت بیدار غافل پوری۔ وہ اپنی تعریف سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ ان کے خراب شعر پر بھی، اگر داد نہ دیں تو تعلقات خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ کوئی ایسی خطرناک چیز کہہ دیں کہ ہماری پولیس انہیں فوراً گرفتار کرے تو ان کی بڑی شہرت ہو جائے گی۔ غالباً ان کا "خطرناک" میں "ناک" پر زیادہ زور تھا۔ مگر وہ کئی بار ناک کا ذکر کرنے کے بعد بھی اس کی وضاحت نہ کر پائے۔ ہم نے سمجھایا بھی کہ پولیس کی ذمہ داریاں یوں کون سی کم ہیں کہ وہ ان میں آپ جیسے بے ضرر کا خواہ مخواہ اضافہ کرے۔ آخر آپ کا استعمال کیا ہوگا؟ انہوں نے برسوں سے دیوان فقط اس لئے نہ چھپوایا کہ انھیں کوئی نام پسند نہیں آیا۔ ان کے غیر پسندیدہ ناموں کی ایک طویل فہرست بطور آٹوگراف بک ان کے ساتھ رہا کرتی ہے جس میں مزید ناپسندیدہ ناموں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دشمنوں کو خطرہ ہے کہ کہیں دیوان سے پہلے وہ دیوان کے متوقع ناموں کی فہرست نہ چھاپ دیں۔

ہمارے ایک افسانہ نگار دوست ہمیشہ بے وقت اور بے موقع مع اپنے تازہ ترین افسانوں کے آن دھمکتے ہیں۔ شیطان کی آنت سے بھی لمبا افسانہ ایک سانس میں سنانے کی ناکام کوشش کے بعد وہ کرید کرید کر اس کی خوبیاں اُگلواتے ہیں۔ پھر انھیں اطمینان ہو جاتا ہے۔ پھر بھوک لگتی ہے۔ پھر سو جاتے ہیں۔ یہ تو خیر قابو میں بھی آجاتے ہیں۔ مگر جب کوئی ناول نگار ناول سنانے کی تمہید باندھتا ہے تو ہم گھر چھوڑ کر بھاگ نکلنے کے امکانات پر از سرِ نو غور کرنے لگتے ہیں۔ اور ہمیں بے تحاشہ وہ معصوم ناول نگار یاد آنے لگتے ہیں جو ناول سنانے کی دھن میں یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہم باقاعدہ سو یا غائب ہو چکے ہیں۔

غرض انہی پڑوسیوں، رشتے داروں اور دوستوں کے درمیان ہماری زندگی کے شب و روز

گردشِ ایام سے ٹکراتے رہتے ہیں۔ جو بھی آتا ہے صاحب، بالکل صاف اپنے مطلب سے آتا ہے۔ اب ہمارے پاس ہمارے اپنے لئے کوئی وقت نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جائیں تو جائیں کہاں۔؟ ہم سوچتے ہیں کہ آج غالب، پریم کی کتابیں پڑھیں گے۔ ابھی کتاب کھولنے کی بھی نوبت نہ آئی تھی کہ پڑوسی کے ساتھ اس کا کتا ڈھونڈنے جانا پڑا۔ کچھ لکھنے کا موڈ بناتے ہیں کہ چلو بھئی مضمون نہ سہی خط ہی سہی تو رشتے دار اپنا مقدمہ نکال کر بیٹھ جاتے ہیں کہ فریقین کے مابین جس زمین پر جھگڑا ہے پہلے اس کی چودھری تو سمجھ لیجئے۔ سنیما جانے کے لئے تیار ہوتے ہیں تو کوئی بے تکلف دوست آجاتا ہے کہ "فلاں حاکم سے فلانے دوست کے بھانجے کے لیے سفارش کر دیجئے"۔ رات کو جب سونے کی کوشش کرتے ہیں تو کوئی شب بیدار سیلانی آن دھمکتے ہیں کہ اس مصروف زندگی میں دن میں موقع نہ مل سکا اس لیے بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں کہ رات بھر گپ لڑائی جائے۔ پارٹنر تمہارا تو چہرہ دیکھنے کو ترس گیا۔ ہاسٹل لائف بھی کیا شاندار تھی؟ تم لوگ علی گڑھ میں چاندنی راتوں میں کیسی مٹر گشتی کیا کرتے تھے؟ اور وہ مسٹر "پادر" مسٹر "لاحول ولا قوۃ" اور "استاد جھوہارا" یاد ہیں؟ یہاں تک کہ خواب میں بھی یہی دیکھتا ہوں کہ شناساؤں کا غولِ بیابانی بے طرح تعاقب میں مصروف ہے۔ اور میں اپنا گھر سر پر اٹھائے جنگل کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہوں۔ گھبراہٹ میں آنکھ کھلتی ہے تو مارے وحشت کے پھر سوچنا شروع کر دیتا ہوں کہ جائیں تو جائیں کہاں؟

وارننگ: کوئی صاحب برائے مہربانی اس مضمون کو بآوازِ بلند نہ پڑھیں، ورنہ ان کے کسی بھی پڑوسی، رشتے دار یا دوست کے آبگینوں کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔ خطرہ ہے کہ طیش میں سامع کو خوفِ خدا نہ رہے۔

گدھے کی شان میں ایک قصیدہ

اے فخرِ چوپایہ! اے سخی المعدہ! اے کریم النفس! اے بزرگ خصلت! اے فقیر طبیعت! اے مظلوموں کے مظلوم! اے صاحبِ جذب! میں تیری بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں، تجھے سلام کرتا ہوں اور تیرے حضور میں سرِ نیاز خم کرتا ہوں!

اے علامہ! اے فاضلِ اجل! اے کتابِ قدرت! تو بھی چوپایہ اور ہم بھی چوپایہ! ہمارا اشرف المخلوقات میں شمار ہے۔ مگر چہ نسبت انسان را عالم خر؟ آدمی کی بھلا آپ سے کیا برابری؟ بقول شخصے وہ پڑھ لکھ کر گدھے پر لاد دیتا ہے۔ دنیا کے علوم و فنون پی کر، دریا کے دریا پی کر وہی سب کچھ آخر میں کرتا ہے جو ہز ہائی نس بلا کسی خر یافتہ تربیت دیتا ری کے انجام دیتے ہیں۔

قدیم یونان و عرب نے سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون اور لقمان جیسے فلسفی پیدا کیے۔ سچ پوچھیے تو آج بھی ایک گدھے کا بچہ ان سے زیادہ سوچ سکتا ہے۔ کیا تاریخ عالم بتا سکتی ہے کہ جب ان فلسفیوں نے اپنے خیالات کا نچوڑ پیش کیا تو ان پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ لیکن جب بھی آپ نے برملا اپنے خیالات کا عطر پیش کرنا چاہا تو بجائے آپ کے افکار سے

روشن ضمیر ہونے کے آپ پر ڈنڈوں کی بارش کی گئی ۔ آپ کی تان سین تک تاب نہیں لا سکتا۔ ادھر آپ رینکے، اُدھر حضرتِ انسان کی عقل گُم ہوگئی ۔ اور کی اُس نے آپ کی شان میں گستاخی۔ مگر میرے حضور اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ آدمی آپ کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہ آخر میں جہاں پہونچتا انسانیت پر رینکتا اور دولتیاں جھاڑتا ہے وہاں سے سرکار کی ابتدا ہوتی ہے ۔

حضور پر نور تو آج بھی فخر سے دُم اُٹھا کر چلتے ہیں ۔ کبھی دُم دبا کر پسپا ہوتے ہیں مگر یہ انسان ؟ اس کے تو دُم ہی نہیں ۔ اس کی حرکتوں نے اُسے نہ صرف جنّت ہی سے نکلوایا بلکہ دُم جیسی نعمت سے بھی محروم کر دیا۔

حضور آپ کے کان ، سبحان اللہ ! ایک گدھے کے کان سے نئو آدمیوں کے کان فٹ ہو سکتے ہیں ۔ پھر بھی گدھے کے پاس اتنا بچ رہے گا کہ آدمی کے کان سے بڑا ہوگا۔ سچ ہے جن کے رتبے ہیں سوا ان کے کان ہیں سوا در سوا۔

حضور جیسا کم آمیز اور کم سخن چوپایہ ابھی تک ماہرین آثار قدیمہ بھی دریافت نہ کر پائے ہیں ۔ بڑے سے بڑے میدان میں تھان پر دوسرے گدھوں تک کو آپ ہمیشہ نولفٹ کر دیتے ہیں اور جگالی کے بہانے غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ۔ حضور کا کام غور و فکر ہے جس کے لئے آپ جگالی کرتے ہیں ۔ یہ آدمی کا بچہ گوشت خور ہونے کی وجہ سے جگالی کے فن سے محروم ہو چکا ہے ۔ ہر چند کہ اس کی تلافی پان سے کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس میں وہ مولوی مدن والی بات کہاں ؟

حضور عدم تشدد کے فلسفے پر جب سے عمل پیرا ہیں ، مہاتما جی کے فلسفے کی ولادت بھی نہ ہوئی تھی ۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے بھی آپ ہی سے روشنی حاصل کی ہوگی ۔ آپ کو کشت و خون سے نفرت ہے ۔ آپ ڈنڈے بازی یا فوجداری سخت ناپسند فرماتے ہیں ۔ آپ کا

مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے۔ آپ کھلے عاشق ہیں اور کھلے میدان جس گدھی سے بھی عشق کریں اسے دوڑا دوڑا کر اظہار عشق کرتے ہیں۔ یہی ایک واحد معاملہ ہے جس میں آپ کا نفس انسان سے بھی موٹا ہے۔ کبھی گدھوں نے اسلحے نہیں بنائے نہ استعمال کیے فقط حفاظت خود اختیاری کے تحت دولتی جھاڑتے ہیں اور محض اُچھل کود کر دشمن کو پسپا کر دیتے ہیں۔

حضور کی صحت ہمیشہ ہم انسانوں میں رشک کا موضوع رہی ہے۔ کبھی نہ سنا گیا کہ حضور کے دشمنوں کو نزلہ زکام ہو گیا یا آپ موسمی شکایات میں مبتلا ہیں۔ جبکہ ادھر ذرا ہوا پانی بدلا، کچھ ٹھنڈا گرم ہوا اور انسان چھینکتا ہوا حکیم ڈاکٹر کے پاس لائن میں لگا۔ مگر بدلے ہوئے موسم اور حالات میں بھی حضور موسم سے بے نیاز غور و فکر یا چرائی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ حضور پر نور کی کھال بڑی موٹی ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ اس نے حضور کو موسم پروف بلکہ فول پروف بنا دیا ہے۔ یہاں آدمی آپ سے مار کھا جاتا ہے۔ آدمی کی گُدّی موٹی ہوتی ہے مگر کھال پتلی ہوتی ہے۔ جو موسم یا مار کی تاب نہیں لا سکتی۔

حضور کو یقین دلاتا ہوں کہ آدمی آپ کی بے حد شاندار شخصیت اور حکمت سے بے حد متاثر ہے اور مرعوب ہے۔ ہمیشہ آپ کا مدح خواں رہا ہے۔ شعر و ادب میں ہمیشہ آپ کو زبردست خراج تحسین پیش کرتا آیا ہے۔ جہاں بھی اسے موقع ملا ہے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔ دنیا کے قدیم ترین ادب میں اپالس کا "دلچسپ گدھا" عالمی کلاسیکی میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ نہ صرف ہیرو ہے بلکہ اسے اس کی محبوبہ اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے گدھا بناتی ہے۔ حسینوں کو ہمیشہ آپ پر رشک رہا ہے "ایک گدھے کے ساتھ سفر" دنیا میں کسی گدھے کا بہترین سفرنامہ ہے۔ حالانکہ مارکو پولو کے سفرنامہ میں بھی آپ ہی نظر آتے ہیں۔ سوئفٹ کے سفرنامے کبھی شہرت نہ پاتے اگر ان میں مُشت خر نہ شامل ہوتی۔ ہر چند کہ انہیں

گھوڑے یا خچر جیسے معزز ناموں سے نوازا گیا ہے مگر اصلیت میں وہ سب گدھے ہیں۔ شر کبھی "فردوسِ بریں" تک نہ پہونچ پاتے اگر ان کے ہیرو ہیروئن حضور کا سہارا نہیں لیتے۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی نظم "ایک گدھا شیر بنا تھا" تو بچوں کو گدھا بنانے کے لئے کورس تک میں شامل ہے۔ عربی ادب کے "مقامات" میں سے اگر آپ کو نکال دیا جائے تو بدیع الزماں وغیرہ کو کون پوچھے گا۔ کرشن چندر نے "ایک گدھے کی سرگذشت"، "گدھے کی واپسی" اور "ایک گدھا نیفا میں" لکھ کر حضور کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اور جس طرح دنیا کو گدھے کا دیوانہ بنا دیا ہے کہ راقم الحروف نے حضور کی جانب سے اس کا شکریہ "گدھے کا خط کرشن چندر کے نام" میں بہ خوبی ادا کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور گدھے بہ کثرت ادب میں شامل ہیں بلکہ گدھے ہی ادب پر حاوی ہیں۔ خصوصاً جدید ادب پر تو ان کا اجارہ ہے۔

حضور انسان بار بار اعتراف کرتا ہے کہ انسانی معاشرے کی تعمیر میں سب سے بڑا حصّہ حضور ہی کا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں، پُرپیچ کھائیوں اور دشوار گذار راہوں پر عمارتیں اور سڑکوں کی تعمیر بلا آپ کے عزم خر کے ممکن نہ تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کو آپ ہمیشہ ڈھوتے رہے اور ڈھوتے رہیں گے۔

حضور کے وطن مالوف یعنی کابل سے بادہ بنکی تک کے گدھے دنیا بھر میں مشہور ہیں حضور گدھوں نے کیسی ترقی کی ہے۔ لیکن ایشیا، جنوبی امریکا، افریقہ کے بیشتر ممالک میں آج بھی گدھا گاڑی سے طوفان میل تک سب کچھ آپ ہی ہیں۔ گدھے سے خچر اور زیبرے تک سب فیض کا سلسلہ آپ ہی کا ہے۔ کیوں نہ ہو؟ آج بھی دنیا بھر میں غریبوں کا موٹر آپ ہی ہیں۔ آپ میں عجب شانِ فقیری، فقیری میں بادشاہی اور بادشاہی میں غریب نوازی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ آدمی جنت سے دنیا میں بھیجا گیا اور دنیا میں آپ نے اس کے پاؤں جما دیئے۔ اگر آپ نہ ہوتے تو اسے مجبوراً جنت میں واپس جانا پڑتا۔ ورنہ دنیا اس کے لئے جہنم ہو جاتی۔ جس میں وہ بلا کسی گدھے کے جلتا یا سلگتا رہتا۔

حضور والا میں آپ کو پھر یقین دلاتا ہوں کہ ہم انسانوں میں آپ کی حیثیت قابلِ رشک ہے۔ ہمارے یہاں آج بھی اس قسم کے شعر و ادب کی کمی نہیں جس میں گدھے کو انسانوں سے افضل دکھایا گیا ہو۔ ہماری روزمرہ زندگی میں جب کسی انسان کے لئے "قطعی طور پر" گدھے" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو ہمیشہ رشک کے طور پر۔

حضور انسانوں میں گدھوں کے لئے ہمیشہ بڑی دوڑ دھوپ رہتی ہے۔ مثلاً ہر کوئی گدھا داماد چاہتا ہے، گدھا ملازم ڈھونڈتا ہے، گدھی بیوی یا گدھا شوہر چاہتی ہے۔ یوں بھی زندگی بھر دونوں ایک دوسرے کو گدھا بناتے رہتے ہیں۔ صدر شعبۂ اردو کے لئے تو یہ لازمی شرط سمجھی جاتی ہے۔ قومی اداروں کی نظامت میں ان کو ترجیح ملتی ہے۔ غرض گدھا بنانے کا عمل انسانوں میں بڑی تیزی سے جاری ہے اور اب تو گدھے بھی قومیائے جا رہے ہیں۔

حضور سچ پوچھئے تو انسانیت کی تعمیر گدھے پنتی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ وقتاً فوقتاً مختلف مذاہب اور فرقے گدھا بنانے کے لئے آپس میں لڑتے لڑاتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کو گدھا بنانے کے لئے ہمارے یہاں باقاعدہ گدھا دوڑ (Donkey Race) ہے۔ لیڈر پانچ سال تک عوام کو گدھا بناتے ہیں۔ الکشن کے موقع پر عوام لیڈروں کو گدھا بناتے ہیں۔ حکومت پبلک کو اور پبلک حکومت کو گدھا بناتی ہے۔ اسی طرح ماں باپ اولاد کو، ناخلف اولاد والدین کو، بھائی بھائی کو گدھا بناتا ہے۔ اگر لوگوں کا بس چل جائے تو سب ایک دوسرے کو مکمل گدھا بنا دیں۔

حضور اکثر لوگ ماں باپ کی مدد سے اولاد کو یا بیٹی بیٹے کی مدد سے ماں باپ کو گدھا بنا کر اپنا الّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ جو لوگ اقتدار کی اونچی کرسی پر ہوتے ہیں ان کے لئے بعض بڑے کارگر حربے ہیں مثلاً کسی کی اتنی زیادہ تعریف کی جائے کہ وہ مارے خوشی کے حضور کی طرح پھول کر گدھا بن جائے۔ فی زمانہ گدھا بنانے کی آسان ترکیب غیبت کرنا یا چغلی کھانا ہے۔

حضور کو شعر و شاعری میں بڑی دلچسپی ہے۔ آپ کی سریلی تانیں کسی دو غزلے یا سہ غزلے سے کم نہیں ہوتیں۔ ہمارے یہاں استادی کا کام عموماً ان پڑھ شاعر انجام دیتے ہیں اور بآسانی علامہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں جو پرانا ہو جاتا ہے وہ استاد کہلاتا ہے۔ اُستاد شاعر عام طور پر پرلے سرے کے گدھے ہوتے ہیں۔ جو اپنے شاگردوں میں اپنا احمقانہ کلام بانٹ کر انہیں شاعر ہونے سے روکتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گدھا یعنی استاد نما شاعر جب ٹیں ہوتا ہے تو اس کا کوئی نام لیوا نہیں ہوتا کیوں کہ شاگرد تو دوسرے اُستاد سے کام لینے اور مشاعرے خراب کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

حضور والا! میں آپ کو تمام انسانوں کی جانب سے یقین دلاتا ہوں کہ ہم تیرے ہیں اب آپ بھی ہمارے ہو جائیے۔ تاکہ ہم سب مستند گدھے ہو سکیں۔ آمین!

———٭———

مت پوچھئے

کیا ہوا جب میرا پہلا مضمون چھپا

جناب یہ آتش کی جوانی کا قصہ ہے کوئی ۱۹۵۰ء میں، میرا پہلا مضمون "من چندِ بیابانم" "راہی" جالندھر میں چھپا تھا۔ اسکے اڈیٹر بلدیو متر بجلی لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ مشہور افسانہ نگار رام لعل کے مہمان تھے۔ ان کے اعزاز میں جو ادبی نشست کا ہنگامہ برپا ہوا، اس میں ہمارا مضمون بھی شامل تھا۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے اس کے عنوان پر ہی بجلی صاحب ہنسنے لگے۔ اور انہوں نے ہماری جانب کچھ اس انداز سے غور سے دیکھا تھا کہ واقعی میں وہی عنوان والی شئے یعنی "چیندِ بیابانم" کس حد تک ہوں۔ جہاں تک مجھے ایمانداری سے یاد ہے، انہوں نے تعریف تو بہت کی مگر مضمون ہم سے نہ مانگا۔ پہلے تو ہم نے مختلف ہتھ کنڈے استعمال کئے یعنی ان کے آگے پیچھے رہنا۔ دوڑ دوڑ کر خدمت کرنا۔ گھوم پھر کر مضمون کا ذکر، یہاں تک کہ وہ اُٹھنے لگے تو ہم نے لپک کر اُن کے جوتے اُٹھا کر انہیں پہنانے کی کوشش کی۔ وہ ہمارے اس اخلاق اور خاکساری سے بڑے متاثر ہوئے۔ مگر مضمون پھر بھی ہم سے نہ مانگا۔ ہم نے جب دیکھا کہ اب یہ سونے کی چڑیا اُڑنے والی ہے تو رام لعل صاحب

کی جانب نہایت مسکین صورت بنا کر مضمون جیب سے نکالا اور انہیں دیتے ہوئے نہایت، گرم گرم ادا کر درخواست کی! "اسے 'راہی' میں ضرور چھاپ دیجئے گا" بجلی صاحب واقعی بجلی تھے وہ بات شروع کرنے سے پہلے ایک نہایت ہی تندرست قسم کا قہقہہ لگاتے' بات کے درمیان قہقہہ لگاتے اور بات ختم کر کے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے جس کا مطلب یہ ہوا کرتا کہ بات ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ تین قہقہوں کے دوران انہوں نے اپنے ہینڈ بیگ کو بلا کھولے اس میں اس طرح مضمون ڈال دیا جیسے لیٹر بکس میں خط ــــــ

ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ بجلی صاحب نے علی عباس حسینی، رضیہ سجاد ظہیر، رام لعل، اور اقبال مجید وغیرہ سے بڑے تقاضے کر کے بڑی مشکل سے افسانے حاصل کئے تھے۔ مگر ہم سے اس مرد مومن نے مضمون نہ مانگا۔ بلکہ ہم نے ان کے سر زبردستی تھوپ دیا۔ اور اس وقت تک سائے کی طرح ان کے ساتھ رہے جب تک وہ لکھنو کے چارباغ اسٹیشن سے جالندھر جانے کے لئے ریل پر سوار نہ ہو گئے۔

ہم کو مضمون چھپنے کا بالکل یقین نہ تھا۔ اس لئے ہم پھر دوسرے مضامین لکھ لکھ کر مضامین نو کے انبار لگانے میں مصروف ہو گئے۔ بجلی صاحب کے جانے کے عرصے بعد زندگی میں پہلی بار ہمارے پاس ایک وی پی ڈاکیہ لایا۔ تو ہمیں یاد آیا کہ ہم نے بجلی صاحب سے کہا تھا کہ "جس شمارے میں آپ میرا مضمون چھاپیں اس کی دس کاپیاں مجھے وی پی سے بھیج دیجئے گا" پھر میں نے سوچا کہ "دس سے کام کہاں چلے گا؟ لہذا آپ کم از کم "راہی" کی پچیس کاپیاں وی پی کر دیجئے گا' میں چھڑا لوں گا" چنانچہ وی پی چھڑا لیا تو پیکیٹ میں صرف ۵ پرچے تھے۔ ایک تو فدا عباس نے اُچک لیا۔ اور رسالہ دیکھ کر بڑے زور سے چلائے "ارے! تم بھی چھپے ہو۔!" میرے اوپر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ بار بار اپنا نام پڑھتا

کبھی عنوان تو کبھی مضمون۔ فدا بھائی نے رسالہ چھین لیا۔ "پہلے مٹھائی کھلاؤ" اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ لوگ جمع ہونے لگے۔ جو آتا ایک رسالہ اُٹھاتا۔ مبارکباد بلکہ تعجب کا اظہار کرتا کہ "اتنی دور کیسے چھپ گئے۔؟ جالندھر تو بہت دور ہے۔؟" غرض فوراً مٹھائی آئی سب مٹھائی کھا کر چلتے بنے۔ بس ایک رسالہ میرے ہاتھ میں تھا وہ باقی رہ گیا تھا۔ اُسے لے کر میں کوٹھے پر اپنے پڑھنے کے کمرے میں چلا گیا۔ اور کوئی پچاس بار مضمون پڑھ ڈالا۔ مارے خوشی کے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ کبھی گانا گانے لگتا کبھی مارے خوشی کے میرے منہ سے چیخیں نکل جاتیں۔ اتنے میں ایک نیک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں آیا۔ جلدی سے کپڑے پہن کر روپے جیب میں رکھ کر سائیکل پر بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔ شہر کے جتنے بک ڈپو اور بک اسٹال تھے۔ ان پر "راہی" کے جتنے پرچے مل سکے خریدتا چلا گیا۔ اُس کے بعد سیدھا گھر آیا اور تقریباً ان پچاسوں پرچوں میں سے دس آڑے وقتوں کے لئے الماری میں تالے میں بند کر دیئے۔ ایک پرچہ اپنی میز پر عام نمائش کے لئے رکھ دیا۔ جہاں سے بھی رسالے خریدتا وہ پوچھتا۔ "ارے بھئی اتنے پرچے کیوں خرید رہے ہو۔؟" تو میں فوراً بہانہ بنا دیتا کہ "احتشام صاحب نے منگائے ہیں شاید طلبا کو انعام میں دیں گے۔" غرض بقیہ پرچے سائیکل کے کیریر پر لگا کر اب ہم خود تقسیم انعامات کی مہم پر نکلے۔ جو راستے میں دوست مل جاتا اُسے روک کر ہم اُس سے بے اختیار لپٹ جاتے اور بتاتے "میرا مضمون "راہی" میں چھپ گیا۔" اسے ایک رسالہ دیتے ہوئے کہتے۔ "بہت دور سے جالندھر سے "راہی" نکلتا ہے۔ لکھنؤ سے بہت سے شاعر اور ادیبوں کی تخلیقات لے گئے تھے مگر چھپا صرف میرا ہی مضمون "من جملہ بیابانم" صفحہ ۲۷ سے شروع ہوتا ہے۔ خدا کے لئے میرے بھائی اس کو پڑھو ضرور لینا۔ ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ گے۔"

اقبال مجید، سبط اختر، حسن عابد، قمر رئیس، شہاب جعفری، قاضی عبدالستار، رتن سنگھ، اقبال ندیم ۔ بزرگوں میں رضیہ آپا، حامداللہ افسر، حیات اللہ انصاری، نیاز فتح پوری، علی عباس حسینی، کوئی کہیں رہتا، کسی کا گھر دور تھا تو کسی کا بہت قریب۔ غرض ہر ایک سے ہم نے اپنا ٹیپ ریکارڈ دہراتے ہوئے التجائے مطالعہ کے ساتھ 'راہی' کا ایک شمارہ خدمت میں پیش کر دیا۔ احتشام صاحب مسکرائے اور بولے "راہی" تو میرے پاس بھی آیا ہے۔ یہ آپ کی پہلی شائع شدہ تخلیق ہے، اس لئے اگر آپ برابر لکھتے رہے تو اس کی تاریخی اہمیت ہوگی۔ اس لئے بجائے مجھے دینے کے آپ اسے خود سنبھال کر رکھئے۔" اس کے بعد بولے ___ "جمال! کتابوں کی دکان سے "راہی" کے تمام شمارے خریدنے کے لئے "میرا نام" لینے کی کیا ضرورت تھی ؟" مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر انہوں نے پیٹھ ٹھونک کر کہا ۔ "خیر کوئی بات نہیں ___" غرض وہاں سے تو کدم جو بھاگے تو سیدھے نیاز صاحب کے یہاں پہونچے 'انہوں نے اتنے زور سے ہمیں ڈانٹا۔ "چھپ ہی گئے تو میں کیا کروں ؟" مگر ہماری دور اندیشی ملاحظہ ہو کہ بھاگے مگر بلا پرچہ اٹھائے ___

اب "راہی" کا کوئی شمارہ سائکل کے کیریر میں باقی نہیں بچا تھا۔ اس لئے نہایت شاداں و فرحاں کافی ہاؤس پہونچے ۔ احباب کی کافی کا بل بھی ہمیں خود ہی بار بار ادا کرنا پڑا ۔ یہاں تک تو غنیمت تھا ۔ گھر واپس گئے اور رات گئے تک اپنے مضمون کا مطالعہ بلکہ حافظہ کرنے کے بعد جب سونے کے لئے لیٹے تو مارے خوشی کے نیند غائب ہو گئی ۔ مضمون سامنا کلا زبن گیا اور جب بھی آنکھ لگے تو خواب میں شاعروں ادیبوں کا ایک ہجوم مضمون پڑھتا اور ہنستا نظر آئے یہاں تک کہ مرغ نے بانگ دی اور ہم نیند سے

مایوس ہوکر "راہی" اُٹھاکر اس وقت تک اس کا مطالعہ کرتے رہے جب تک کہ میرے چھوٹے بھائی اقبال نے رسالہ چھین کر ناشتے پر چلنے کی فرمائش نہ کردی۔ بہت جلد اس پہلے مضمون کے چھپنے کا نشہ اس لئے ٹوٹ گیا کہ دس ہی بارہ دن بعد اتفاق سے ہمارے دو مضمون دو مختلف رسالوں میں چھپ کر آگئے اور پھر یہ بھی نہ یاد رہا کہ ہمارا پہلا چھپا ہوا مضمون کہاں ہے؟ مگر پھر کبھی وہ مسرت و حیرت اور ہلچل "نقوش" میں چھپ کر بھی پیدا نہ ہوسکی جو پہلی بار "راہی" میں چھپ کر ہوئی تھی۔

ذکر اس پری وش کا

ایک بے تکلف محفلِ احباب میں جو بھی اللہ کا بندہ رخصت ہوتا۔ اُس کی غیبت شروع ہو جاتی۔ پہلے اس کی شخصیت کی بخیہ ادھیڑی جاتی، پھر تار تار کردی جاتی اس دوران اگر کوئی شامت کا مارا آجاتا تو سب لپک کر اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے، وہ بھی اس فری اسٹائل غیبت میں شامل ہو جاتا۔ پھر کوئی صاحب کھسکتے تو بارش کے پہلے قطرے کی طرح یوں ابتدا ہوتی:

"صاحب! ان کا بھی دَم غنیمت ہے!"——

دوسرے مہربان ٹکڑا لگاتے۔

"اجی! یہ بڑے حضرت ہیں——"

بارش تیز ہو کر ژالہ باری میں تبدیل ہو جاتی۔ غیبت ہوتی رہی لوگ آتے، رہے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ صرف دو درویش ماضی کے الاؤ کو کریدنے کے لئے باقی رہ گئے۔ دونوں کسی طرح اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتے۔ ایک صاحب جو خیر سے صاحبِ خانہ واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلو بدلتے ہوئے فرمایا۔

"اچھا تو اب یار سویا جائے۔"

دوسرے صاحب اس نیک مشورے پر عمل کرتے ہوئے فرش پر دراز ہونے لگے۔ صاحب خانہ سے نہ رہا گیا۔ بولے۔

"حضرت کیا ارادے ہیں؟ حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے' بیٹھ گئے' لیٹ گئے' لیٹ گئے'، اور بقول ننھے سو گئے سو گئے۔ آخر بھابی انتظار کرتی ہوں گی؟" وہ منہ پھلا کر بولے۔

"ضرور انتظار کرتی ہوں گی۔ مگر آخر میں جاؤں کیسے؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"جانے میں آپ کو کیا قباحت ہے؟" کہنے لگے۔

"یہی کہ ادھر میری پیٹھ پھری اور شروع کی آپ نے میری غیبت۔ میں نہیں جاتا واتا۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔

"میرے بھائی! آخر میں کس سے تمہاری غیبت کروں گا؟ تمہارے سوا یہاں دوسرا کون ہے؟" انھوں نے کہا۔

"تمہارے گھر میں اور کوئی نہیں مگر تم نے جو یہ بکری پال رکھی ہے ضرور اس سے تم میری غیبت کرو گے۔"

غیبت، منافقت اور ٹانگ کھینچنا دراصل ایک پیچیدہ تہذیبی عمل کے لامتناہی سلسلے ہیں جو جتنا مہذب ہوتا ہے وہ اتنا ہی بڑا منافق بلکہ آدم خور واقع ہوتا ہے۔ غیبت کے لئے قریب یا قرابت ضروری سمجھی گئی ہے۔ دوستی، رشتے داری، بیٹی داری کچھ تو تعلق خاطر ہو۔ ظاہر ہے کوئی بھلا آدمی راستہ چلتے تو آپ کی ٹانگ کھینچنے سے رہا۔ آخر دوستی کی طرح دوستی نما دشمنی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اس کا فارمولا بڑا ہی دلچسپ ہے جیسے "یہ دوست ہمارا دشمن ہے' یہ عزیز ہمارا مخالف ہے' یہ پڑوسی ہمارے خلاف ہے' یہ دفتر یا کارخانے کا رفیق ہمارا ساتھی ہے۔ اس لیے اس سے کچھ لینا ہے۔ دیکھیں یہ کیسے کامیاب ہوتا ہے۔ آگے بڑھتا ہے لیکن دوست کا دوست' عزیز کا عزیز پڑوسی کا

پڑوسی یا رفیق کا پاس بقول" چانکیہ ہمارا دوست ہے جس سے مل کر سازگاری باقی ہے بیشتر رہنا ہے۔

ماہرین نفسیات جن کی نفسیات انتہائی مشکوک ہوا کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آپ بڑھے اور کڑھے ہیں تو ظاہر ہے بات بات پر لٹھ بونگا تو بھولو پہلوان کی طرح کرنے سے رہے۔ مگر غیر محسوس طریقہ پر آپ باآسانی ٹانگ کھینچ سکتے ہیں۔ آپ کو اس فعل سے کوئی روکے گا بھی نہیں اور آپ اپنے یار کو باآسانی بے یار و مددگار بھی کر دیں گے۔ آپ اس لیے ایسا کریں گے کیونکہ آپ کے ذہن میں آپ کی ترقی کی تصویر آپ کے دوست کی بربادی کی شکل میں ابھرتی ہے۔

منافق اس ذات شریف کا نام نامی ہے جو سائے کی طرح دن رات آپ کے ساتھ رہتا ہو، لیکن ہر موقع پر منافقت سے کام لیتا ہو۔ اگر اسے اس کا موقع نہ ملے تو وہ بے چین و بے قرار ہو جائے۔ اس کا دل بیٹھ جائے۔ لیکن جب آپ مار کھا جائیں، قسمت آپ کو گھائل کر دے تو وہ پہلا شخص ہو جو آپ کے زخم پر مرہم رکھے۔ یہاں تک کہ وہ منزل آجائے جب سیزر، بروٹس کو پہچان تو لے مگر دم توڑ دے۔

میں ایک صاحب کو جانتا ہوں، جو میرے ایک دوست کے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ بلکہ نوالہ پیالہ بھی انہیں کا ہو چکا تھا۔ دوست کے پاس صرف ان کی دوستی رہ گئی تھی جس کے وہ علی الاعلان قصیدہ خواں تھے۔ انھوں نے دوست کی نوکری چھڑا دی، دوست ان کے اور قریب ہو گیا انھوں نے دوست کا گھر بکوا دیا۔ دوست ان کے گھر آگیا۔ انھوں نے دوست کو پردیس بھجوا دیا۔ یہ سب کچھ دوست کی اس وقت سمجھ میں آیا جب دوست نے اس کی بیوی بھی ہتھیالی۔ آخر دوستی نے دشمنی کی شکل اختیار کر لی۔

غیبت پر یاد آیا کہ ہمارے ایک دانشور دوست جو شاید آج کل ٹمبکٹو یا ہونولولو میں ماہر حشرات الارض ہیں کسی زمانے میں ہمارے رفیق کار تھے۔ ہمیشہ چپراسی سے دفتر کے باہر پورٹیکو میں چائے منگوا کر ہمیں باہر بلواتے۔ انھوں نے پورٹیکو کا نام "غیبت محل" رکھا تھا۔ جہاں وہ

بڑی معصومیت سے گنجے فرشتے کی طرح فرمائش کرتے۔ "چلئے غیبت محل، ہوجائے ایک پیالی چائے پر کچھ اور غیبت۔" اگر ہم کہتے "یار ابھی بہت کام ہے"۔ تو بڑی بے بسی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہتے۔ "یار بہت پیٹ پھول رہا ہے۔" پھر ہم دونوں ہنستے ہوئے اسکول فار اسکینڈلس' میں پہونچتے چائے کے ہر گھونٹ پر دفتر کے بگ باس سے چپراسی تک کی کھال اُتار کر رکھ دیتے اس کے بعد طبیعت ہشاش بشاش ہوجاتی۔ وہ اپنی ڈسک پر واپس جاکر بجلی کی طرح اپنا کام شروع کر دیتے اور ذرا دیر میں اخبار کا نیا ایڈیشن تیار ہوجاتا۔ ہمیں ان کی ایک بات بہت پسند تھی وہ جتنی شدت سے دوسروں کو ناپسند کرتے اس سے کہیں شد و مد سے اپنی تعریف نہ صرف خود کرتے بلکہ اس انداز سے گفتگو کرتے کہ آپ ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ مخاطب کو اقبالی مجرم بنا کر اس سے اپنی تعریفیں اگلواتے۔ جب کبھی ان کا نزلہ مجھ پر گرتا تو میں ان کی تعریف حلوے کی طرح ہضم کر جاتا۔ بس پھر ان کا سارا زور مجھے منانے یعنی مجھ سے اپنی تعریفیں کروانے پر صرف ہوجاتا۔ میرا دعویٰ ہے کہ جب کبھی غیبت کے فن پر کوئی کتاب لکھے گا تو اس فن کے علمبرداروں میں ان کا ذکر خیر سنہری حروف میں کرے گا کیوں کہ وہ اس معاملے میں اپنے والد مرحوم تک کو نہ بخشتے۔ اگر کبھی مرحوم کا ذکر خیر کرتے بھی تو یوں غیبت سرا ہوتے۔

"اللہ مرحوم کو جنّت نصیب کرے۔ بڑی خوبیوں کے مالک تھے لیکن خدا جھوٹ نہ بلوائے تو مزاج میں تشدد بہت تھا۔ بڑے آتش مزاج واقع ہوئے تھے۔ ایک روز کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹ کھٹائی مرحوم نے ملازم سے کہا۔

"جا، جا کے دیکھ آ، کون آیا ہے!" ملازم نے آکر کہا۔

"آپ سے ملنے کوئی آیا ہے!"

مرحوم آپے بلکہ جامے سے باہر ہوتے ہوئے گرجے۔

"ابے ہمارے پاس آدمی نہیں تو کیا جانور آئے گا؟"

"جا، جا کر نام پوچھ کر آ ــــ یہ"

غرض عظمت کے نشے میں بدمست ہو کر وہ اپنے والد مرحوم کی شخصیت کو روئی کی طرح دھن ڈالتے۔ جی بھر کے غیبت کے بعد ان کا موازنہ اپنے آپ سے کرتے۔ دونوں کی شخصیت دھرم کانٹے پر تولتے۔ اپنا پلّہ جب بھاری ہو جاتا تو ان کا پیٹ پچک جاتا۔ پھر وہ بڑے مطمئن اور مسرور نظر آتے۔

اس دنیا میں لوگ دوستی سے زیادہ مصاحبت پسند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ کسی کی ہاں میں ہاں ملائیں یا کوئی ان کی ہاں میں ہاں ملائے۔ دراصل وہ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ سے کچھ زیادہ چاہتے بھی نہیں جس کے لیے غریب گروہ اور پارٹیاں بناتے ہیں، تحریکیں چلاتے ہیں۔ پُرامن بقائے باہم کے لیے سب سے پہلے ایک اناؤنسر پکا کیا جاتا ہے۔ گروپ یا پارٹی لیڈر کی قصیدہ خوانی اس کے فرائض میں شامل ہوتی ہے۔ جس کی ذرا بھی گاڑی چل جاتی ہے وہ ادب کا چھپر سر پر اٹھا کے ادب پر بادشاہت کے خواب دیکھنے لگتا ہے۔ ہر لیڈر اپنے گرد اپنے سے چھوٹے شاعر ادیب جمع کرتا ہے۔ تاکہ اس میں اس کا قد نمایاں رہ سکے۔ اس کے بعد وہ بجائے پڑھنے لکھنے کے کانفرنسوں اور جلسوں کے مالیخولیا میں مبتلا ہو جاتا ہے پھر ہر بڑے شاعر اور ادیب کو چاروں شانے چت گرانے پر وہ اپنا سارا زورِ کلام بلکہ زورِ بازو تک صرف کر دیتا ہے۔ بونوں کی بادشاہی کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ جسمانی طور پر معذور ہو کر رفتہ رفتہ گمنام نہ ہو جائے۔

ہمارے ایک کانفرنسی یار جن پر کانفرنس بلانے اور ادبی ہنگامے کروانے کے باقاعدہ دورے پڑا کرتے ہیں۔ جب تک کہ کوئی کانفرنس یا ادب میں ہنگامہ نہ ہو وہ جوان نہ صرف کمزور بلکہ بیمار رہتا ہے بلکہ اس پر یہ بھی خوف طاری رہتا ہے کہ کہیں زمانہ اسے بھلا نہ دے۔ لیکن اِدھر ملّی کے بھاگوں

چھینکا ٹوٹا دور ہی سے کسی کانفرنس کے آثار نظر آئے ادھر انھوں نے بغل میں فائل دبائی اور بساطِ کانفرنس بچھا کر بیٹھ گئے۔ اس کو کاٹو اچھا فلاں کے نہ آنے سے بدنامی ہوگی تو اس کے بدلے اسی علاقے کے فلاں کو بلالو۔ اور ہاں فلاں کو تو بلانا ہی پڑے گا۔ تو اسے فلاں کے بعد پڑھوا دینا خود ہی ہُوٹ ہو جائے گا۔

غرض خدا خدا کر کے کانفرنس کی نیک ساعت آئی تو شاعر ادیب سے زیادہ فوجی کمانڈر نظر آنے لگے ہر طرف شاگردوں اور چمچوں کو فوج کی طرح لڑانے لگے۔

"شاباش بہادرو! خبردار! جانے نہ پائے! مارو! مارو! کاٹو! دوڑالو! پکڑلو! باندھو!"

کانفرنس ہوگئی تو خبریں اس حکمت سے بنوائیں کہ خبر میں جدھر سے بھی دیکھا جائے سب سے بڑا سر انھیں کا نظر آئے۔ افواہ ہے کہ انھوں نے اپنے کانفرنسی وصیت نامے کی بھی فائل تیار کرلی ہے کہ ان کی وفاتِ حسرت آیات پر ایک "ہندپاک تعزیتی کانفرنس" ہو جس میں پبلسٹی کے لیے ان کے شاگردوں میں جانشینی کی باقاعدہ جنگ منظوبہ ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کانفرنس میں چاہے جتنے بھی شگوفے پھوٹیں مگر پھیکی رہے گی کیونکہ یہ موصوف کے جیسے ماہر اور تجربہ کار سے محروم ہوگی۔

—— ⁘ ——

چمچہ کانفرنس

چمچہ کانفرنس کا افتتاح کرنے ایک بہت بڑا سونے کا چمچہ کھڑا ہوا، جو سب سے نمایاں، لمبا تڑنگا، کہنے کو چمچاتا ہوا چمچہ تھا۔ پر قد میں کفگیر سے بھی نکلتا ہوا۔ اس نے پاٹ دار آواز میں کہا:

"میرے چمچے بھائیو! میں بادشاہی چمچہ ہوں! میں نے کتنے راج بدلتے دیکھے، جانے والے کو پلٹ کر نہ دیکھا۔ مجھے ان گنت راجاؤں اور بادشاہوں کا منہ لگا چمچہ رہنے کا فخر حاصل ہے۔!"

ایک زنگ لگے، ہیچ میل دھات والے بدصورت چمچے نے انتہائی بازاری انداز میں فقرہ کسا۔ "چمچے صاحب بادشاہی چمچوں کا دور تو کب کا گذر گیا۔ اب تو ہر طرف جنتا کے چمچوں کا زور ہے۔!"

بادشاہی چمچے نے بڑی حقارت مگر انتہائی وقار اور رکھ رکھاؤ سے پوچھا:
"آخر آپ کس کے چمچے ہیں؟"

زنگ خوردہ چمچے نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "میں کسی کا چمچہ وچمچہ نہیں۔"

سونے کے چمچے نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا واقعی، یہ دنیا اب اتنی گر چکی ہے کہ کوئی کسی کا چمچہ نہ رہے؟ اگر آپ کسی کے چمچے نہیں ہیں تو اس چمچہ گیری کے دور میں زندہ کیسے ہیں؟"

بادشاہی چمچے اور جنتا کے چمچے میں بیچ بچاؤ کے لیے پلیٹنم کا چمچہ کھڑا ہو گیا۔ جو چمچہ کانفرنس کی صدارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

چمچوں کی نگاہوں میں سیکڑوں بجلیاں سی کوند گئیں۔ بہت سی چمچیاں اس کے جلوے کی تاب نہ لا کر غش کھا گئیں۔ تمام معزز چمچے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ سب اس کے چمچے معلوم ہو رہے تھے۔ پلیٹنم کے چمچے نے دور دور تک لائٹ مارتے ہوئے کہا:

"میں سات سمندر پار کا امپورٹیڈ چمچہ ہوں۔ چمچہ گیری کرتے میری عمر گذر گئی۔ دنیا کے تجربات کی بنیاد پر آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ بے جا ہمت سے کوئی فائدہ نہیں۔ بھائیو! عزت کی زندگی گذارنے کے لیے کسی نہ کسی کا چمچہ ہونا ضروری ہے۔ یاد رکھیے ہم اپنی زندگیاں کسی کا چمچہ رہنے یا اس کی آرزو میں گذار دیتے ہیں۔"

سونے کے چمچے نے کہا۔ "جناب والا! جس کے بھی چمچے ہوں، مگر ہیں بہت شاندار، ضرور کسی شہنشاہ کے چمچے ہوں گے۔"

پلیٹنم کے چمچے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "بتانے کا زمانہ نہیں میرے بھائی! دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کبھی ہمارے بھی زمانے تھے، مگر اب چھاپے کے خوف سے چھپے چھپے پھرتے ہیں۔ اگر چمچہ کانفرنس میں کوئی بھی خفیہ پولیس کا چمچہ موجود ہوا، تو ابھی پکڑ لیا جاؤں گا۔ آپ سے بھی کیا چوری۔ میں اسمگلروں کے بادشاہ کا چمچہ ہوں۔" مختلف بولیوں سے ایک ساتھ آواز آئی۔

"اچھا اچھا! جناب صدر ببیا آچمچہ ہیں۔؟"

"جی نہیں! خاکسار ہانگ، کانگ کا چمچہ ہے!"

"جناب والا کا مشغلہ؟"

"جی! وہی پیشۂ آبائی، چمچہ گیری۔"

اتنے میں ایک لمبا تڑنگا انتہائی گندہ المونیم کا چمچہ کھڑا ہوگیا اور بولا۔

"مجھ سے ملئے میں ہوں آپ سب کا پُرانا چمچہ!" اُس کے پاس سے اتنی سخت، بدبو آرہی تھی کہ پلیٹنم اور سونے کے چمچے ایسے بَچک کر ہٹ گئے جیسے وہ انہیں کاٹ ہی تو کھائے گا۔ انہیں ڈر تھا کہیں اس کی جوئیں نہ ان کے چڑھ جائیں۔ انہوں نے اپنی ناکیں بند کرلیں ——

وہ بولا:

"پلیٹنم کے چمچے صاحب! میں بھی اسمگلر آپ بھی اسمگلر! اپنا ہی بھائی بند سمجھئے! جو کام آپ چمک دمک کے پردے میں دکھاتے ہیں وہ ہم چمچے گندگی کی آڑ میں انجام دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ گندا دھندہ، گندگی سے بڑھتا ہے۔ پھر کامیابی سے کوئی جلتا بھی نہیں۔"

پلیٹنم کے چمچے نے کہا —— "گویا راہیں جُدا جُدا، پر منزل ایک ہے!"

اتنے میں ایک چاندی کا چمچہ کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "سچ ہے ہم سب کی ایک ہی منزل ہے مجھے دیکھئے۔ میں ڈاکٹروں کا چمچہ ہوں۔ مجھے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا چمچہ رہنے کا فخر حاصل ہے

—— کسی نے پوچھا ——

"چمچہ گیری کی آڑ میں جناب کا مشغلہ کیا ہے؟"

"اپنا دھندہ تو دو نمبر کی دوائیں اور انجکشنوں کا ہے۔"

یہ سنتے ہی چاندی کے چمچے پر لے ہو، لے ہو شروع ہوگئی۔

"اِسے نکالو! یہ قاتل ہے!"

"اسے بٹھادو! یہ زہر کا سوداگر ہے۔"

پلیٹنم کے چمچے نے چاندی کے چمچے کو بٹھاتے ہوئے "آرڈر آرڈر" کہہ کر چمچوں کو خاموش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اتنے میں ایک اسٹین لس اسٹیل کا چمچہ کھڑا ہوگیا اور بڑی پاٹ دار آواز میں دھواں دھار تقریر شروع کردی "میں لیڈروں کا چمچہ ہوں، میں تاریخ ہوں، جب چاہوں تاریخ مسخ کرکے رکھ دوں۔ بڑے سے بڑے لیڈر کی نکیل ہوں، جسے چاہوں ڈبو دوں، مخالفت پہ آؤں تو بیڑا غرق کردوں۔ میرا کوٹہ پرمٹ لائسنس اور غیر ملکی مبادلۂ زر کا اتنا بڑا دھندہ ہے کہ اگر بھنک بھی کوئی پا جائے تو ابھی اندر ہوجاؤں۔ میں بالکل نہیں پسند کرتا کہ دوسروں کے چکر میں چمچے آپس میں لڑیں۔ ہمارا کام اُلّو سیدھا کرنا ہے، نہ کہ اُلّو بننا؟"

اسٹین لس اسٹیل کے چمچے کا سارے چمچوں پر بڑا رعب پڑا۔ اتنے میں جھلّا کر ایک بیلچہ نما لوہے کا چمچہ کھڑا ہوگیا، جو چمچے سے زیادہ پھاوڑا معلوم ہورہا تھا۔ لوہے کے چمچے نے کہا:

"میں ہٹلر کا چمچہ ہوں۔"

ہٹلر کا نام سنتے ہی ایک ترقی پسند چمچے کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس نے بگڑتے ہوئے پوچھا:

"اگر آپ ہٹلر کے چمچے ہیں تو جناب کا اس کانفرنس میں کیا کام؟ یہ تو اپنا معاملہ ہے۔"

ہٹلر کے چمچے نے کہا:

"ہٹلر کا ساتھ تو کب کا چھوٹ گیا۔ اب تو دیسی بھائیوں کا ساتھ ہے۔ شاید آپ نے کبھی کوئی بلوہ فساد نہیں دیکھا، ورنہ آپ مجھے بآسانی پہچان لیتے۔ جو کام آپ تقریروں سے کرتے ہیں، وہ ہم ڈنڈے کے زور سے کرانے کے قائل ہیں۔"

ایک رکابی نما پیتل کا چمچہ یہ کہتا ہوا کھڑا ہوگیا کہ "آپ بھی ٹھیک ہیں اور آپ بھی۔"

کسی نے پوچھا۔ "جناب کی تعریف؟"

"میں شعر و ادب کا چمچہ ہوں۔"

یہ سُنکر کہ چمچے شعر و ادب تک میں دخیل ہیں، کانفرنس میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

رکابی نما چمچہ بولا:

"میں نقاد ہوں میں ادب کے آگے آگے چلتا ہوں۔ خاکسار ڈاکٹر اسپون ایم اے پی اچ ڈی۔ ڈی لٹ، ڈی فل۔ ڈی ڈی ٹی کے نام سے دنیائے ادب میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔ کچھ لکھتا وکھتا نہیں۔ مگر لکھنے والوں کی ہوا ٹائٹ کیئے رہتا ہے۔"

ڈاکٹر اسپون "دی کریٹک" کے دنیائے ادب پر نو دولتیوں کی طرح اترانے پر کچھ دانشوروں کے چمچوں نے ہوٹنگ شروع کردی۔ رانگے کے دستی چمچے نے ڈاکٹر اسپون کو بٹھلاتے ہوئے کہا:

"بھائیو! میں انجینئروں کا چمچہ ہوں۔ میں بھاکڑہ ننگل تک میں سوراخ کرچکا ہوں۔ میں ایسی سڑکیں، نہریں اور پل بنوا چکا ہوں جن کا وجود آج تک محض کاغذی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" میری انجینئرنگ کے آگے اسمگلروں اور چور بازاروں تک کے چمچے مات ہیں۔ میں فخر روزگار ہوں۔ میں چاہوں تو کوئی عمارت، باندھ، پل یا سڑک ایک برسات بھی نہ جھیل پائے۔ میں انگلینڈ ریٹرن ہوں۔"

انگلینڈ ریٹرن چمچے کا تالیوں کی گونج میں چمچوں نے خیر مقدم کیا۔ ابھی وہ مزید گل افشانی کرنے والا تھا جس کے بعد تعارفی تقریب ختم ہو کر اجلاس کی باقاعدہ کارروائی شروع ہوتی کہ ایک بہت ہی تاؤ دار لوہے کا چمچہ، جو چمچے سے زیادہ کانٹا معلوم ہو رہا تھا، کھڑا ہو گیا اور انتہائی ڈپٹ کر بولا۔

"میں آپ سب کو نئے قانون کے تحت گرفتار کرتا ہوں"۔ سونے کے چمچے نے گھبرا کر پوچھا:
"ہمیں گرفتار کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ مسٹر جمہوریت ہے' آزادی ہے' کانفرنس کرنا تمام چمچوں کا بنیادی حق ہے۔ آپ ہمیں اظہار رائے کی آزادی کے حق سے محروم نہیں کر سکتے۔"

اس نے کہا: "میں پولیس کا چمچہ ہوں"۔

"آپ کوئی بھی ہوں' مگر ہیں تو چمچے۔ اگر سب چمچوں کو بند کر دیا گیا' تو یہ انتظام اور قاعدے' قانون کون چلائے گا"۔

پولیس کا چمچہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چمچوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ اُس کے سیٹی بجاتے ہی چاروں طرف سے کانفرنس پر پولیس ٹوٹ پڑی۔

بار بار آنسو گیس اور لاٹھی چارج کے باوجود چمچے منتشر نہیں ہو رہے تھے اور تشدد پر اُتر آئے تھے۔ مجبوراً پولیس کو فائرنگ کرنی پڑی۔

میں نے جان بچانے کے لئے اسٹیج سے جیسے ہی ایک لمبی چھلانگ لگائی' ایک چیخ کے ساتھ آنکھ کھُل گئی۔ ٹانگیں ادوائن میں پھنسی تھیں' بقیہ جسم زمین پر مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

——— ✣ ———

ہماری آدھی زندگی نوکری ڈھونڈتے گذر گئی اور باقی نوکر کی تلاش میں ۔

ہمیں دو بہت چُست اور پھُرتیلے نوکروں کی ضرورت تھی، کیوں کہ اب ہم بالسن کی مہربانی سے افسر ہو گئے تھے ۔

ہم نے دفتر سے فائیلیں وغیرہ لانے والے اپنے دونوں چپراسیوں سے کہا ۔ "ایک آدھ دن میں نئے نوکر آجائیں گے تب تک تم لوگ ہمارے گھر کا کام کاج کر دیا کرو۔"

چپراسیوں نے بہت بے رُخی کے ساتھ جواب دیا ۔

"صاحب! ہم دفتر کے کام کے نوکر ہیں نہ کہ گھر کے ۔"

ان کو گھورتے ہوئے ہم نے ڈانٹ کر پوچھا ۔ "کیا مطلب؟"

دونوں چپراسی فوراً تن کر کھڑے ہو گئے اور بولے ۔ "صاحب آنکھیں مت دکھائیے ۔ اگر اپنے گھر کے کام کے لئے کہا تو ہمیں آپ کا گھراؤ کرنا پڑ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے سب چپراسی دفتر میں ہڑتال بھی کر دیں ۔ آپ تو آپ چیف سکریٹری تک ہم سے کچھ کام نہیں لے سکتے ۔"

چپراسیوں کے تیور دیکھ کر ہم نرم پڑ گئے اور ان سے کہا ۔ "اچھا ہمیں دو نوکر لادو۔"

یہ بات ہم نے ان سے اس طرح کہی جیسے کہہ رہے ہوں "سامنے کی دوکان سے دو ڈبی سگریٹ لادو۔"

چپراسیوں نے تعجب سے پوچھا۔ "نوکر؟"

"ہاں! ہاں! نوکر!!"

"ارے صاحب، اس مہنگائی میں بر، مکان، نوکری اور نوکر بھی کہیں ڈھونڈے ملتے ہیں۔ ڈھونڈ نے سے خدا تو مل سکتا ہے لیکن نوکر نہیں مل سکتا۔"

چپراسیوں کے اس گستاخانہ جواب سے پریشان، خاموشی ہی میں خیریت دیکھ کر ہم گھر کے اندر چلے گئے۔

نل کے نیچے جوٹھے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ چولہے پر ہانڈی جل رہی تھی اور پیاری بیگم صاحبہ مسالا پیس رہی تھیں۔ مرچ کی جھاک سے آنسو جاری تھے۔ ان کی جوانی پر ترس کھاتے ہوئے ہم نے برتن مانجھنا شروع کیا۔ انھوں نے سل پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے نوکر تلاش کیجئے۔"

رشتے دار، دوستوں اور دفتر والوں سے نوکر کی فرمائش، فرمائش کی حد تک بے سود ثابت ہوئی تو مجبور ہو کر "ضرورت نوکر" کے کالم میں اخباروں میں اشتہار نکلوا دیا اور اس کے جواب میں کچھ درخواستیں بھی آئیں۔ امیدواروں کو بلوا کر باقاعدہ "انٹرویو" بھی لے ڈالا۔

ایک صاحب سر پر کلاہ باندھے طرہ لگائے، کمر میں پٹکا کسے، مونچھیں اور جوتے چمکائے پیشہ ورانہ بے کار کے ساتھ ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے، پہلے تو انہوں نے شبہ کی نظر سے ہمارا جائزہ لیا کہ ہم میں مالک بننے کی اہلیت کس حد تک ہے اور ہے بھی یا نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارا انٹرویو لیا۔ ہم پر ترس کھا کر بولے۔

"آپ کتنے پیسے تک دے سکتے ہیں؟"

"مناسب پیسے دے دیں گے۔"

"آپ کس قسم کا کھانا پسند کرتے ہیں؟"

ہم نے قدرے وضاحت چاہی تو مونچھیں اینٹھتے ہوئے بولے۔ "ہندستانی، ایرانی، انگلستانی، جاپانی، اطالوی جس قسم کا آپ پسند فرمائیں۔

ہم نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ "ہم تو صرف ہندستانی کھانا کھانے کے عادی ہیں۔

بولے۔ "ہندستانی میں تو اتر پردیش، مہاراشٹر، تلنگانہ، آسام، پنجاب اور کشمیر وغیرہ سبھی کے کھانے آجاتے ہیں۔ صاف صاف بتائیے۔"

عرض کیا۔ "زیادہ سے زیادہ اتر پردیش اور کم سے کم دہلی والا کھانا ہم کھا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے ہمارا باورچی خانہ دیکھ کر بُرا سا منھ بناتے ہوئے کہا۔

"نہ اس میں دھواں نکلنے والی چمنی ہے نہ دھلوانا۔" ہیں کہ اشارے سے سب صاف ہو جائے اور دم بھی نہ گھٹے۔ اس میں پائپ، واش بیسن، برتن دھونے کی مشین، گرینڈر، کلیننگ مشین، کافی مشین، لسی مشین، پریشر کوکر، گیس چولہا، فین، کچن کوکنگ ریوالونگ اینڈ رولنگ، انرجی چیئر اور کوکنگ ٹیبل وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے۔ سافٹ کوک تک نہیں ہے اور نہ کہیں ٹوسٹر، ہیٹر اور الکٹرک کیتلی ہی نظر آرہی ہے۔

"کچن کا نہ کمپاؤنڈ ہے نہ گارڈن نہ کوک کٹر نہ اوپر کے کام کے بیرے۔ یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ اس لئے اگر آپ ہمیں پانچ سو روپے مہینہ بھی دیں تب بھی ہم آپ کے یہاں کام نہیں کر سکتے۔"

یہ کہہ کر وہ بغیر ہمارا اسلام لئے چلا گیا۔

اُن کے جانے کے بعد دوسرے صاحب تشریف لائے۔ دیکھنے میں ہلاکو اور چنگیز کی اولاد معلوم ہو رہے تھے۔ آتے ہی بہت بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ اطمینان سے سگریٹ سلگا کر آڑے ترچھے کش لیتے ہوئے بولے۔ "آپ کو شاید کوک کی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آپ کے یہاں چھوٹی بڑی کئی حاضریاں ہوتی ہیں؟"

ہم نے کہا، چار۔

انہوں نے کبوتر کے خون کی طرح چہرہ لال کرتے ہوئے بہت تعجب کے ساتھ کہا۔

"صرف چار۔"؟

"جی ہاں، دو بڑی اور دو چھوٹی یعنی صبح شام ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا۔"

اس کے بعد انہوں نے پوچھنا شروع کیا۔ "گھر میں کتنے آدمی ہیں؟ روزانہ آنے جانے والوں اور مہمانوں کی تعداد کا اوسط کیا ہے؟ اسپیشل ورائٹی کیا کیا بنواتے ہیں۔؟ دورے پر کوک ساتھ جاتا ہے یا نہیں؟ آپ کتنی تنخواہ، مہنگائی بھتا، سفری الاؤنس، بونس اور چھٹیاں دیتے ہیں۔ گورنر صاحب کے یہاں جب میں کام کرتا تھا تو ہفتہ میں کل تین حاضریاں تیار کرنا پڑتی تھیں جن کے لیے ہم کو ایلیون اٹینڈینٹ ملتے تھے۔ آپ کے یہاں کتنے آدمیوں سے کام لینا ہوگا۔ عام طور پر مہمانوں کے ٹپ اسٹینڈرڈ اور اندازاً اس کی کل رقم کتنی ہوگی؟"

وہ ابھی ہمارے نوکر رکھنے کے حوصلے کو اور کم کرتے کہ ہم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان سے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ـــ "ٹھیک ہے۔ ہم اپنے فیصلے سے خط کے ذریعہ آپ کو مطلع کریں گے۔" اور وہ ہم سے شیک ہینڈ کر کے رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد تیسرے صاحب چک اُٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ ایک دم سوٹیڈ بوٹیڈ

گورے بھیج تھے۔ منھ میں چرچل مارکہ سگار لگائے بڑی شان سے آرام کرسی پر لیٹ گئے۔

تھوڑی دیر تک کمرے اور ماحول کا جائزہ لینے کے بعد بولے۔ "اگر آپ کے ٹرمس پسند آئے تو تین مہینے کا اپوائنٹمنٹ لینا منظور کرلوں گا۔"

ہم نے ان پر سوالیہ نگاہ ڈالی تو بولے۔ "گورنمنٹ آف انڈیا کے آفیشیل کوک سپروائزرس ریفریشرز کورس کے لئے امریکہ اور روس دو سال کے لئے جانا ہے اس سے پہلے انگلینڈ اور جرمنی کا کورس پورا کرچکا ہوں۔ ہلٹن ہوٹل کی وجہ کر دنیا کے ۵۲ ملکوں کے مینو مجھے زبانی یاد ہیں۔ پانچ سو طریقے سے تو صرف چائے بنا سکتا ہوں۔ ہزاروں کھانے مجھے پکانے آتے ہیں۔"

اس اطمینان کے ساتھ کہ اس کامیاب ہاتھی کو بھی ہم اپنی ڈیوڑھی میں نہیں باندھ سکتے ہم ان کی باتیں سن کر جل بھن کر کوفتہ بننے کے بعد کچھ موڈ میں اپنے آپ کو لانے کے لئے بولے۔

"آپ لونگ لتّی بنانا جانتے ہیں؟"

وہ گڑبڑا کر بولے۔ "کیا راجستھانی ہے؟"

"نہیں خالص بہاری چیز ہے۔"

انہوں نے آسمان سے زمین پر آتے ہوئے پوچھا۔ "مغل ڈش؟"

ہم نے بہت ہی بھروسہ کے ساتھ کہا۔ "نہیں جناب خالص سوری کوارٹر پلیٹ ہے۔"

معافی چاہتے ہوئے انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ "سوری .... سو .... سوری اور کوارٹر پلیٹ کیا معنی؟"

ہم نے کہا۔

"لاسٹ ریفریشمنٹ میں ڈش یہاں کوارٹر پلیٹ اور پر پیک چلتی ہے۔"

"اور سوری .....! ..... ساری؟"

"جی نہیں ساری اس کے لیے جو جانتا نہ ہو اور سوری اس لئے کہ شاہانِ سور اس کے حکمراں تھے۔ شیر شاہ سوری کے شاہی دستر خوان کی چیز تھی۔"

وہ عاجز ہو کر بولے۔ "یہ کیسے بنتی ہے؟"

ہم نے بازی مارتے ہوئے اکڑ کر کہا۔ "اب لونگ لتی بھی آپ کو سکھاؤں تو باورچی رکھنے سے فائدہ؟ خود ہی کیوں نہ سب کچھ کر لوں۔" اس کے بعد ہم نے ان سے پوچھا۔

"آپ فرائڈ بھٹاٹا بنانا جانتے ہیں؟"

"بھٹاٹا؟"

"جی ہاں بھٹاٹا۔"

بولے۔ "اس کا تو میں نے کبھی نام بھی نہیں سُنا، بھٹاٹا کی بھاٹا؟"

ہم نے تعجب سے چلا کر کہا۔ "ارے آپ بھٹاٹا تک نہیں جانتے تو پھر نوکری کی کیا ضرورت ہے۔ جائیے تین ماہ آرام کیجئے۔ اس کے بعد دنیا کا دورہ شروع کر دیجئے، بھٹاٹا بھی اسی دنیا کے روزانہ استعمال کی چیز ہے۔ اس بار اپنا دورہ بمبئی سے شروع کیجئے گا تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ بھٹاٹا اور بھانٹا میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

اور وہ اپنا سا منھ لے کر چل دیئے۔ ان کے بعد جو تھے صاحب تشریف لائے، جو فلمی انداز کا زنخوں والا میک اپ کئے تھے۔ ایک خاص ادا کے ساتھ جھک کر لکھنوی انداز میں سلام کیا۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ "آپ کیا جانتے ہیں؟"

بولے۔ "چاہے اندر کا کام لیجئے چاہے باہر کا، یا اِدھر اُدھر کا۔ بس ایک کام لیجئے۔"

ہم نے پوچھا۔ "یہ اندر باہر اور اِدھر اُدھر کیا ہوتا ہے؟"

بولے۔ "چاہے کھانا پکوا لیجئے، یا گھر کے دوسرے کام لے لیجئے۔ جیسے جھاڑو برتن
مسالا وغیرہ یا بازار سے سودا سلف منگا لیجئے۔" کچھ رُک کر وہ بولے۔ "صاحب بات یہ ہے
کہ میں بہت ہی اصولوں والا آدمی ہوں اور ہر طرح کے کام میں پھر اصول نہیں رہ جاتا۔"

ہم نے ان سے عرض کیا۔ "مگر مجبوری یہ ہے کہ ہم خود بڑے بے اصول والے
ہیں اور جب جو کام یاد آتا ہے یا ضرورت پڑتی ہے نوکر سے فوراً وہ کام لے لیتے ہیں۔
کیوں کہ ہم ٹائم ٹیبل بنا کر زندگی گزارنے کے عادی نہیں ہیں۔ ہماری اس مختصر سی دل
توڑنے والی تقریر کا ان پر اتنا خراب اثر پڑا کہ وہ ایک عدد فرشی سلام کر کے فوراً رخصت ہو گئے۔

اس کے بعد ایک صاحبہ ہاتھ میں گھڑی باندھے تشریف لائیں۔ شکل صورت کھلے
ٹھلے سے ماما سے ادھک ملکائن لگ رہی تھیں۔

انہوں نے پہلے تو اطمینان کرنے کے لئے ہم سے تمام اہم پہلوؤں پر بات چیت
کی۔ "آپ زیادہ سے زیادہ کتنی تنخواہ دے سکتے ہیں۔ روزانہ کتنی دیر رہنا ہوگا؟"
وقت کی پابندی پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

"اگر آپ کو کھانا پکوانا ہے تو دونوں وقت کا کھانا ایک گھنٹے میں تیار کر کے چلی جایا
کروں گی۔ اگر کھانا اور ناشتہ دونوں ضروری ہے تو ڈیڑھ گھنٹہ رُک جاؤں گی لیکن ۲۵ روپے
گھنٹہ کے حساب سے چارج کروں گی۔"

ہم نے پوچھا۔ "۲۵ روپے گھنٹہ روز کے حساب سے؟"
ہنستے ہوئے بولیں۔ "جی نہیں، ابھی اتنا اندھیر نہیں۔ بس واجب ۲۵ روپیہ
گھنٹہ ماہوار کافی ہوگا۔

پھر بات کو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"جھاڑو نہیں دوں گی، برتن نہیں مانجھوں گی، مسالا نہیں پیسوں گی، بازار سے سودا نہیں لاؤں گی، آٹا پسوانے نہیں جاؤں گی۔ مالکن یا گھر والوں کی باتیں یا جھڑکیاں نہیں سنوں گی۔ بس کام سے کام' روزانہ ٹھیک صبح چار بجے آجایا کروں گی اور ساڑھے پانچ بجے واپس چلی جایا کروں گی۔ اگر کھانا پکاؤں گی تو کھانا گھر لے جاؤں گی۔ اگر ناشتہ بناؤں گی تو ناشتہ لیا کروں گی۔ پکانے کے دوران چائے بنا بنا کر پیا کروں گی۔ دوسرے جب میں آؤں تب کھانے کا سب سامان اور برتن وغیرہ تیار ملے۔ چولہا جلا ہوا ہو۔"

ہم نے کہا۔ "مگر ہم تو صبح سات، آٹھ بجے تک سو کر اٹھتے ہیں۔ دوسرے باقی وقت میں تم کیا کروگی؟"

بولیں۔ "تو کیا ہوا۔ جب آپ لوگ سو کر اٹھا کریں گے تو کھانا ناشتہ تیار ملا کرے گا چاہے ناشتہ کریں یا کھانا کھائیں۔ زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے کہ اپنے لئے چائے بڑی کیتلی میں لیا کروں گی تاکہ آپ لوگوں کو اٹھتے ہی بیڈ ٹی مل جایا کرے۔"

ہم نے ان سے اصرار کیا کہ وہ ہمارے یہاں دن میں آکر کام کر دیا کریں۔ مگر وہ "ٹیم نہیں ہے۔" پر افسوس کرتی ہوئی چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد ایک بڑے صاحب مع ایک عدد بڑی بی کے تشریف لائے اور بولے۔ "حضور جو دے دیں گے وہ ہم لے لیں گے جو کھلا دیں گے وہ کھا لیں گے اور جو حکم دیں گے وہ فوراً ہی پورا کریں گے۔"

یہ سنتے ہی میری باچھیں کھل گئیں۔ حقیقت میں ہم ایسے ہی شریف اور فرماں بردار نوکر کی تلاش میں تھے۔ اس لئے ہم نے انہیں فوراً ہی نوکر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تنخواہ کیا ہوگی تم دونوں کی۔"

بڑے میاں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ "سرکار اپنے اوپر سے نچھاور کریں گے اس سے ہم نہال ہو جائیں گے۔ ہمیں تو سر چھپانے اور عزت سے دو روٹی کھانے کی خواہش ہے۔"

ہم نے مذاق میں کہا۔ "تم دونوں کو دو روپیہ اور کھانا ملے گا۔ بولو منظور ہے؟"

دونوں نے یک آواز ہو کر کہا۔ "منظور ہے۔"

پھر ہم نے دونوں کی مناسب تنخواہ مقرر کر دی۔ ایک کمرے میں رہنے کا انتظام کر دیا۔ اور دونوں شوہر بیوی نے بڑے شوق سے ہمارے گھر کام کاج شروع کر دیا۔ دن بھر بڑے مزے مزے کی چیزیں بنا کر کھلائیں اور ایسے سلیقے سے ہر کام کیا کہ بیگم صاحبہ تک ہمارے اس انتخاب پر پھڑک اٹھیں۔

دوسرے دن دونوں نوکروں نے ہمارے گھر کی صفائی میں خاصی دلچسپی لی اور پورے گھر کو آئینہ بنا دیا۔ بکس ڈھنگ سے سجا کر رکھ دیئے۔ الماریوں کے سامان کو ترتیب سے رکھا۔ فرنیچر ایک خاص ڈھنگ سے سجائے۔ گملے ایک بالکل نئے ڈھنگ سے سجائے۔ غرض پورا گھر ڈرائنگ روم بنا دیا۔ کھانا پکانے اور گھر کے کام کاج سے ذرا بھی فرصت ملتی تو دونوں گھر کے کونے کونے کا جائزہ لے کر ہر چیز کی ترتیب ٹھیک کر کے گھر کی سجاوٹ میں چار چاند لگا دیتے۔ تین چار ہی دنوں میں انہوں نے گھر کو جنت بنا دیا۔

نئے نوکروں کے آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک صبح بیگم نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا اور بولیں۔

"یہ سب دروازے کیسے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے ہیں۔ کیا آپ بند کرنا بھول گئے تھے؟
میں نے اٹھ کر معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ اتفاقاً ایک آدھ دروازہ یا کھڑکی کھلی رہ سکتی ہے۔
ارے، کھڑکی اور پھاٹک تو الگ رہے یہ الماریاں کیسے کھلی پڑی ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی

ہر کمرے کو دیکھا۔ تمام الماریاں اور بکس کھلے پڑے تھے اور ان کا باقی سامان بے ترتیبی سے کمروں میں بکھرا ہوا تھا۔ سیف کھلی ہوئی تھی اور بالکل خالی نظر آ رہی تھی۔ گھر کا قیمتی مال و اسباب نظر نہیں آ رہا تھا۔ نوکروں کو کئی آوازیں دیں۔ پھر اُن کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ خالی ہے۔ بیگم نے پوچھا۔ "دونوں نوکر کہاں ہیں؟"

ہم نے عقلی گدا لگاتے ہوئے کہا۔ "شاید ہوا خوری کے لئے گئے ہوں گے۔"

انہوں نے جل کر کہا۔ "اور ہمارا سامان۔ لئے کہیں ٹہل رہے ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟ مگر وہ تو دیکھنے میں بڑے سیدھے معلوم ہوتے تھے۔"

"جی ہاں، انہیں کی سیدھائی سے گھر کتنا ٹیڑھا نظر آ رہا ہے۔"

"تو کیا وہ نوکر نہیں چور تھے؟"

"اور نہیں تو شاہ تھے کمبخت۔"

اس کے بعد ہم بہت اِدھر اُدھر بھاگے، انہیں ہر طرف تلاش کیا۔ پولس میں رپورٹ لکھوائی مگر وہ ایسے رفوچکر ہوئے کہ پھر ہاتھ نہ لگے۔

بس وہ دن اور آج کا دن ہم لوگ صرف بجائے نوکر کے ایماندار نوکر ڈھونڈتے رہتے اور خود اپنے نوکر بنے رہتے ہیں۔ کام کے وقت اپنے نوکر، خالی وقت میں مالک معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اب بھی مایوس نہیں ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اگر کبھی بھی قسمت نے ساتھ دیا تو بالکل ایسے ہی ہمیں نوکر مل جائیں گے جیسے کسی کے نام اچانک لاٹری نکل آئے۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟

———٭———

غالبؔ اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹیڈ

جب غالبؔ کا چلن بڑھا اور غالبیوں نے غالبؔ صدی تک منانے کی تیاریاں شروع کردیں تو "مسٹر سر پھٹوڈل" جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف مسٹر سے مولانا بلکہ بقلم خود "علامہ"... تک ہو چکے تھے اور جو عرصے سے میرؔ سوز کا مردہ زندہ کرنے میں سرگاڑی پیر پہیہ کئے ہوئے تھے، یکلخت "میرئیے" سے "غالبیئے" ہو گئے۔ کیونکہ مرزا کی صدی کا معاملہ تھا اور مولانا اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی رسّی لاکھ دراز ہو مگر وہ سو سال کسی حال میں بھی زندہ نہیں رہ سکتے، چنانچہ ان کے محتاط اندازے کے مطابق اب غالبیہ ہونے میں زندگی بھر کی روٹیوں کا ٹھکانہ اور زرغن کے امکانات تھے۔

مولانا سر پھٹوڈل نے لہٰذا آگا پیچھا دیکھتے ہوئے ایک عدد "غالبؔ اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹیڈ" قائم کر ڈالی۔ جس کے وہ چپراسی سے ڈائرکٹر تک بن بیٹھے۔ مگر چند ادبی مصلحتوں کی بنا پر انہوں نے ڈائرکٹری کہلانا پسند کیا اور چپراسی ہونے کی یار لوگوں کو ہوا بھی نہ دی۔

"غالبؔ اینڈ کمپنی" کے زیر اہتمام انھوں نے ایک آل ایشیا قسم کی غالب فیڈریشن"

بنا کر اس خود ساختہ فیڈریشن کی پبلسٹی کا کام سنبھال لیا۔

مولانا سرپھٹوڈل کے ایک بدترین ناقد کے قول کے مطابق "اگر علامہ پڑھے لکھے بھی ہوتے تو وہ اردو کے برنارڈ شا قرار پاتے۔" لیکن ان کی زبانی برنارڈ شا ہونے میں نہ کسی کو کلام ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ "علامہ اگر نمایشے نہ ہوتے تو ضرور کہیں پبلسٹی افسر ہوتے۔"

مولانا سرپھٹوڈل نے مرزا غالب کا چارج لیتے ہی بڑی دھوم دھام سے مرزا کی ایک نایاب تصویر ڈھونڈ نکالی۔ اسے ایک قد آدم فریم میں آویزاں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک علاوہ "جشن تصویر غالب" برپا کیا۔ جس میں چن چن کر وہ تمام لوگ جمع کئے جن میں سے زیادہ تر نے اس جشن میں پہلی بار مرزا کا نام نامی اور اسم گرامی سنا تھا۔ اور وہ مرزا سے ملاقات کے لئے بے تاب تھے۔ بلکہ ان میں سے دو ایک با اثر حضرات تو اس پر بھی تیار تھے کہ مرزا غالب کی ادبی پنشن جاری کروا دی جائے اور ایک صاحب نے تو یہ فیصلہ تک کر لیا کہ اس بار کیوں نہ مرزا غالب کو پدم بھوشن کا خطاب دلوا دیا جائے۔

اخبارات اور رسائل نے لمبے چوڑے تعریفی آداب و القاب کے ساتھ نمایاں طور پر مرزا کی تصویر شائع کی اور جب کسی بد ذوق نے اس جانب توجہ مبذول کرانی چاہی کہ "مرزا کی یہی تصویر 'نسخہ حمیدیہ' میں موجود ہے اور 'نگار — غالب نمبر' میں بھی شائع ہو کر عام ہو چکی ہے تو مولانا سرپھٹوڈل نے یہ کہہ کر ان کو خاموش کر دیا کہ "غالب کی ایک ہی طرح کی دو تصویروں میں سے ایک نسخہ حمیدیہ میں سے شائع ہو کر جابجا نقل ہو چکی ہے اور دوسری ان کے پاس محفوظ ہونے کی وجہ سے نئی کا درجہ رکھتی ہے۔"

مگر اس دندان شکن اعتراض نے مولانا سرپھٹوڈل کے دانت اتنے کھٹے ضرور کر دیئے

کہ جہاں انھوں نے مزید اعتراضات کا جواب اس لئے نہ دیا کہ 'جواب جاہلاں باشد خموشی'
وہاں انھوں نے بد ذوق غالبیوں کو غالب کی پھر کوئی دوسری "نایاب تصویر" نہیں دکھائی۔

اس کے بعد مولانا سر پھٹوڑول نے "غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹیڈ" کے زیر اہتمام غالب کے غیر مطبوعہ خطوط کا ایک مجموعہ "غالب کے غیر مطبوعہ خطوط" شائع کردایا جس کی رسم اجراء انھوں نے آل ایشیا پیمانے پر کی یعنی ایک ملک کے صدر نے اس کا افتتاح کیا دوسرے ملک کے وزیر اعظم نے اس کی صدارت کی اور تیسرے ملک کے بادشاہ نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ نتیجے کے طور پر مولانا سر پھٹوڑول کی اس کتاب کی ساری کاپیاں تینوں ملکوں کی لائبریریوں نے خرید لیں اور سارا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔

جب کسی رسالے یا اخبار کے اڈیٹر تک کو مولانا کی یہ بین مملکتی تالیف تبصرے تک کے لئے نہیں ملی تو ایک سر پھرے اڈیٹر نے اپنے غیر ملکی دورے کے دوران ایک لائبریری سے خاص طور پر علامہ کی کتاب نکلواکر نوٹس بناکر پڑھی اور اپنے ملک واپس آکر اس کتاب پر دھواں دھار تبصرہ کیا۔ اور علم ریاضی کی مدد سے اس کتاب کو بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ پہلا حصہ یعنی پچاس فیصدی خطوط بجنسہ "اردوئے معلیٰ" میں مل جاتے ہیں۔ اور دوسرا حصہ یعنی بقیہ پچاس فیصدی نادر و نایاب خطوط "عود ہندی" میں محفوظ ہیں۔

بقیہ بچتا تھا تعارف۔ پیش لفظ اور مقدمہ جو دوسروں نے لکھے تھے۔ مثلاً تعارف کی رسم مولانا ابلق ایام نے ادا کی تھی۔ پیش لفظ گورنر جنرل بنجر ہاٹ کا تحریر کردہ تھا اور مقدمہ رئیس التحریر نواب بے ملک نے لکھا تھا۔ غیر مصلحت اندیش مبصر کا دعوا تھا کہ" اس عجیب و غریب کتاب میں مولانا سر پھٹوڑول کے نام کے سوا ان کا کچھ بھی نہیں ہے اور بقیہ جو کچھ بھی دوسروں کا ہے۔ جس پر اُسے شبہ ہے کہ ان دوسروں نے بھی انہیں کہیں تیسروں

سے لکھوایا ہوگا۔ جس پر سوائے سرقہ اور توارد کی خوفناک بحثیں چلنے کے کچھ نہیں ہو سکتا جس کے نتائج ہر صورت میں علامہ کے حق میں بہتر نہ ہوں گے۔"

اس سرپھرے اڈیٹر نے یہ تبصرہ ان تینوں ملکوں کے اخبارات اور رسائل میں اشاعت کے لئے دے دیا۔ جس کی وجہ سے تینوں ملکوں میں مولانا "بلیک لسٹ" کر دیئے گئے۔ اس ناخوشگوار حادثے کے بعد مولانا نے "یو این او" کے ممبر ملکوں کی فہرست منگوا کر دیکھی اور اطمینان کا سانس لیا کہ دنیا کے ملکوں کی اکثریت ابھی ایسی ہے جہاں وہ بلیک لسٹ نہیں ہیں اور اپنا کاروبار اُن میں بہ خوبی چلا سکتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا سرپھوڑ دل نے بڑی عرق ریزی سے غالب کا غیر مطبوعہ کلام "طاق نسیاں" کے نام سے ترتیب دیا۔ مگر افسوس کہ کلام غالب ابھی پریس ہی میں تھا اور اس کے جشن افتتاح کی زیر زمین تیاریاں زیر غور ہی تھیں کہ کوئی ناشدنی حاسد کاتب سے سازباز کر کے اس کی نقل لے اڑا اور جس دن "غیر مطبوعہ کلام غالب" شائع ہوا اُسی دن کئی عدد غالبیوں نے یہ مشترکہ بیان جاری کر دیا کہ "کلام غالب" کے نام سے یہی کتاب اس سے پہلے مولانا عبدالباری آسی شائع کروا چکے ہیں۔" معاملہ متنازعہ ہونے کی وجہ سے کتاب تو ضرور ہاتھوں ہاتھ بک گئی مگر اس کا کسی غالب کے طرفدار نے سنجیدگی کے ساتھ کوئی "نوٹس" نہیں لیا۔

اس سانحے کے بعد مولانا سرپھوڑ دل نے مرزا غالب کے فکر و فن کی جانب سے بالکل آنکھیں پھیر لیں اور "مرزا غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ" کا کاروبار انھوں نے مرزا کی شخصیت کو اُبھارنے تک محدود کر دیا۔

یہی وہ محفوظ کاروبار تھا جسے وہ آخر دم تک نہایت مستعدی اور پامردی کے

ساتھ چلانے کا انہوں نے اب تہیہ کر لیا تھا۔

چونکہ یہ اِن کا اصلی میدان تھا اس لیے اس میں ان کے جوہر بہت جلد کھل گئے۔ اور غالؔب سے زیادہ ان کی دھاک جمتی چلی گئی۔

مولانا سر پھٹوّل روزانہ غالؔب کے سلسلے میں ایک بیان جاری کرتے جس میں ہمیشہ غالؔب سے زیادہ اپنے آپ کو نمایاں رکھتے۔

سب سے پہلے تو انہوں نے انجمن سازی پر توجہ دی۔ اپنی آل ایشیا انجمن کی شاخوں کے تمام بیانات اور خبریں غالؔب کمیٹی سے جاری کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے دور افتادہ مقامات پر بھی غالؔب کمیٹیاں قائم کرنا شروع کر دیں۔ مثلاً "ایورسٹ بیس غالؔب کمیٹی" کی خبر یوں چھپی تھی ــــ "جاپانی کوہ پیما ٹیم جو اس بار کوہ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے جائے گی۔ وہ اپنے ساتھ مرزا غالؔب کی تصویر اور دیوانِ غالؔب بھی لے جائے گی۔ چوٹی سر کرنے کے بعد یہ "ایورسٹ غالؔب کمیٹی" "یوم غالؔب" منائے گی۔ پھر چوٹی پر مرزا کی تصویر نصب کر کے مرزا کا کلام کوہ ایورسٹ کی چوٹی پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دے گی" ــــ واضح ہو کہ اس سے قبل کن چن جنگا اور قراقرم کی چوٹیوں پر بھی غالؔب کمیٹی مرزا غالب کو پہنچا چکی ہے۔

یہ تو مولانا سر پھٹوّل کے غالبی بیانات کا ایک نمونہ تھا ورنہ عام طور پر وہ اس قسم کے بیانات جاری کرتے ہیں:۔

ــــ "ڈربی ریس غالؔب کمیٹی"۔ اوّل آنے والے گھوڑے کو مرزا غالؔب کے نام کے اعزاز سے نوازے گی۔

ــــ "خاندانی منصوبہ بندی غالؔب ہفتہ" ــ اس دوران تمام نس بندی کروانے اور صاحبِ توپ حضرات کو دیوانِ غالب کی ایک جلد پیش کی جائے گی۔

واضح ہو کہ مرزا غالب خاندانی منصوبہ بندی تحریک کے زبردست علمبردار تھے اور انہوں نے زندگی بھر۔ "ایک۔ دو یا تین بچے۔ ہوتے ہیں گھر میں اچھے "۔ پر عمل کیا اور اس تعداد کو بھی حتی الامکان گھٹاتے ہی رہے۔"

غالب کمیٹی کے سرمائی اور گرمائی اجلاس کے بعد انہوں نے دریائی اجلاس، بارانی اجلاس، صحرائی اجلاس اور پاتالی اجلاس تک کیے۔

جب اجلاسوں سے کچھ فرصت ملی تو انہوں نے کمیٹی بازی پر مزید توجہ دے کر کمیٹی کی مالی حالت مضبوط کی۔ مثلاً اِدھر کہیں سوکھا پڑا یا باڑھ آئی اور انہوں نے "غالب سیلاب امدادی فنڈ" یا "غالب خشک سالی فنڈ" کے منہ کھول دیئے یہاں تک کہ اگر کہیں فتنہ فساد برپا ہو جاتا تو یہ "غالب ریلیف فنڈ" کی اپیل فوراً جاری کر دیتے۔

اس کے بعد انہوں نے مرزا غالب کے سلسلے میں ٹریڈ یونین تحریک سے دلچسپی لی اور "غالب ہڑتال"۔ یوم غالب۔ یعنی اس دن بجائے دفتر یا کارخانے میں کام کرنے کے کارکنان اپنے مطالبات کی حمایت میں یوم غالب منائیں گے۔ "جب معاملہ یہاں تک بڑھا کہ "غالب بھشتی یونین، غالب باربر یونین، غالب کس گر یونین، غالب صفائی مزدور یونین اور غالب گنا کسان یونین تک بنا ڈالیں۔ تو کسی دشمن نے یہ ہوائی اُڑا دی کہ "اِن میں سے کسی بھی یونین کو " غالب " کے یونین میں شامل ہونے کا کوئی علم نہیں ہے "۔ تو معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا۔ اور مجبوراً ڈائرکٹر غالب اینڈ کمپنی پرائیویٹ لمیٹیڈ مولانا سر پھوڑول کو ایک وضاحتی بیان جاری کرنا پڑا جس میں وضاحت کم اور معذرت زیادہ تھی۔

اس کے بعد ڈائرکٹر غالب کمیٹی نے "جشن غالب صد سالہ تقریبات منانے کی اخبارات اور رسائل میں بڑے زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ایک

عظیم الشان غالب نمبر نکالنے کے اعلان کا کام بھی شروع کردیا۔ مگر ہوا یہ کہ غالب پر کام کرنے والے مولانا سے اتنے عاجز آچکے تھے کہ انہوں نے خیرِ غالب اسی میں جانی کہ وہ "غالب صدسالہ تقریبات" سے عذابِ غالب کو دور ہی رکھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کمیٹی تقریبات غالب کے سلسلے میں مولانا نے بنائی تھی اس نے مولانا کو کمیٹی سے غائب کردیا اور غالب نمبر کی ادارت سے ان کا نام اُڑا دیا۔

اس صدمۂ عظیم نے ماہرِ غالبیات مولانا سر بھپوُل کو مرزا غالب سے اتنا متنفر کردیا کہ جس دن جشنِ غالب ہو رہا تھا اُسی دن مولانا سر بھپوُل "آل انڈیا اکبر اکیڈمی" تشکیل کر رہے تھے۔ "تاکہ اکبر پر بھی کچھ کام ہو سکے"۔
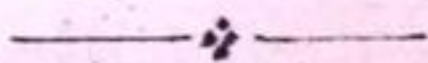
اقبال کی تلاش میں

اقبال صد سالہ تقریبات سے پہلے ہماری اقبالیات میں اس لئے کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہو سکا کہ کالج میں جو بزرگوار "اقبال" پڑھاتے انہیں سونے سے فرصت نہ تھی۔ یونی ورسٹی میں جن صاحب سے پالا پڑا، اول تو انہیں علامہ سے شدید نظریاتی اختلاف تھا، دوسرے پڑھانے کے نام ہی سے انہیں سانپ سونگھ جاتا۔ وہ پڑھ سکتے تھے، لکھ سکتے تھے، فتنے برپا کر سکتے تھے مگر پڑھا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً ہم نے باہری دنیا کا سہارا لیا، جہاں علامہ اقبال کے ڈنکے پٹ رہے تھے۔ ہماری سب سے زیادہ رہنمائی اشتہاروں، پوسٹروں اور سائن بورڈوں نے کی یا پھر اجتماعی زندگی نے۔ سینما کے اشتہاروں نے ہمیشہ ہمیں متاثر کیا۔ جن میں اصرار ہوتا ہے

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

ہم نے ہمیشہ ایسے 'ہیر آئیل' کی شیشی خریدی جس پر صاف صاف لکھا ہوتا ہے

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر

ہمیشہ اس دکان سے سرمہ خریدا جہاں سائن بورڈ ——

مرا عشق میری نظر

بخشنے کا دعویٰ کرتا

پیدائش سے موت تک شاید ہی زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس نے حکیم الامت کو سمجھنے میں مدد نہ دی ہو۔

ایک عزیز کے یہاں چھٹی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ جہاں قوالی کی مدد سے جڑواں بچوں کے لئے دعا کی جا رہی تھی۔ ع

خدا ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

اسی طرح قبرستان میں قبروں کے کتبوں پر کلامِ اقبال کے ایسے ایسے حکیمانہ نکات سمجھ میں آئے جن تک یوسف سلیم چشتی اور مولانا غلام رسول مہر کے ذہن بھی نہ پہنچ سکے۔

ایک کمزور دل پڑوسی میر صاحب مرحوم کی قبر پر لکھا تھا ع

جرأت ہے تو انکار کی دنیا سے گزر جا

ایک قبر پہ ارشاد تھا۔ ع

حکمِ سفر دیا تھا کیوں اب میرا انتظار کر

خدا بھلا کرے ریڈیو اور قوالوں کا کہ بلا پڑھے کلامِ اقبال پر جھومنے کا ہمیشہ موقع دیا۔ قوال کی گنگری پر اشعار سے غرارے کا شبہ ہوتا اور اس پر ردیف کی ریہرسل کا دھوکا ہوتا۔ شکایت کرنا مومن کی شان کے خلاف ہے اس لئے ہم نے ہر ایسی قوالی کو سراہا جو کہیں بھی "اقبالیات" کے نام سے پیش کی گئی۔

علامہ اقبال صدی تقریبات شروع ہوتے ہی پہلی بار ہم نے محسوس کیا کہ ہم اقبال کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ جدھر دیکھئے اقبال ہی اقبال۔ کیا مجال جو کسی رسالے یا

اخبار کا کوئی گوشہ اقبال کے کسی نہ کسی شعر سے خالی نظر آجائے۔ طعنے، تشنیع، نصیحت اور دھمکی تک اشعارِ اقبال سے دی جاتی ہے۔ شاعر مقرر ہو جائے تو اقبال کے شعر سے سامعین کو موٹ کر دیتا ہے۔ بڑے لوگ رعونت کے لئے اسرار خودی کا سہارا لیتے ہیں۔ چھوٹے لوگ خوشامد کو طائر لاہوتی کی مدد سے نبھاتے ہیں۔ رند شراب و کباب میں رموز بیخودی تلاش کرتے ہیں۔ چندہ خور قوم کو مونڈنے کے لئے شاہیں بچوں کے دل و پر اچھالتے ہیں۔ رشوت خور دہقاں کی روزی اور خوشۂ گندم کی آڑ لیتے ہیں۔ دن کو تقدیرِ اُمم کے لئے شمشیر و سناں کا زبانی جہاد کرنے والے رات کو طاؤس و رباب میں شہید ہو جاتے ہیں۔

ایسے اقبال سیمیناروں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا جہاں سیاست داں مستقبل سنوارتے ہیں۔ طلباء پیپر آؤٹ کرنے کا مطالبہ کرتے، کاروباری حضرات کوٹہ، پرمٹ، لائسنس اور پبلک کے مصائب پر رقت انگیز تقریریں کرتے، ادیب نکتہ چینی کرتے اور نقاد سب کو 'کیش' کرتے ہیں۔

اقبال صدی سیمیناروں کے سلسلے میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمیں جن اقبالی موضوعات پر دعوتِ فکر دی جا چکی ہے ان میں سے کچھ ملاحظہ ہوں۔

" علامہ اقبال کی پسندیدہ ترکاریاں ——— کیا اقبال ویجی ٹیرین تھے؟ ——— علامہ اقبال اپنے حقہ کا خمیرہ کہاں سے منگواتے تھے؟ ——— خواجہ حسن نظامی سے جوڑوں کے درد کا تیل منگوانے کے پس منظر میں شاعر کی عمومی صحت اور اس کا ان کی شاعری پر اثر ——— اقبال اور چوپائے ——— اقبال کی پسندیدہ چڑیاں ——— کلامِ اقبال میں کنجشک کے مقام کا تعین ——— اقبال کا شہباز اب کہاں ملتا ہے؟ کلامِ اقبال میں لفظ خودی کے اعداد و شمار اور فیصد تناسب ——— کیا اقبال نے

علی بخش کی فرمائش پر جواب شکوہ لکھا تھا ـــــ شاعر مشرق حکیم نہیں ڈاکٹر تھے ـــــ شاہین، بچوں پر اقبال کا اثر ـــــ اگر اقبال کے شارح نہ ہوتے ـــــ ؟

لیکن کچھ موضوع ایسے تھے جو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتے مثلاً :

"علامہ اقبال کی فہم رسا میں مستقبل کی آزاد ایشیائی مملکتوں کے حدود اربعہ ـــــ کلامِ اقبال کا صوتی آہنگ کو زی تجسوتیوں اور غنائی آوازوں کے زیر و بم میں ـــــ فلسفہ مابعد الطبعیات میں عربی و رومی کی رجعت قہقری اور علامہ اقبال کے فلسفۂ بے خودی کا آہنگ بلند بام ـــــ قرونِ وسطیٰ میں ملتِ بیضا کے درخشاں ماضی کے شوکتِ پاستاں کی روشنی میں حکیم الامت کا استحکام ملت جمہوریت کے آئینے میں ایک معراجِ انسانیت ـــــ

کچھ موضوع عام فہم بلکہ عوام فہم بھی تھے جیسے :

"خلا اور اقبال ـــــ اقبال اور خدا ـــــ اقبال اور قرآن ـــــ اقبال اور عشقِ رسول ـــــ اقبال اور خلافت ـــــ اقبال اور شہید کربلا ـــــ اقبال اور اسلام ـــــ اقبال اور جمہوریت ـــــ اقبال اور سوشلزم ـــــ اقبال اور خودی ـــــ اقبال اور عشقِ وطن ـــــ اقبال اور فیملی پلاننگ ـــــ فلسفۂ اقبال ـــــ کیا اقبال شاعر تھے ـــــ ؟"

ہمارا تجربہ ہے کہ اقبال سیمیناروں میں فاضل مقرر پہلے سے طے کر کے حملہ آور ہوتے ہیں۔ کوئی اقبال کو ولی کامل بتاتا ہے تو کوئی تنگ نظر اور متعصب ـ کوئی انہیں مسلمان کہتے شرماتا ہے تو کوئی ثابت کرتا ہے کہ نہیں نہیں اقبال نہ مذہبی انسان تھے اور نہ مسلمانوں کے شاعر تھے۔ کوئی انہیں فلسفی ثابت کرتا ہے۔ تو کوئی انہیں شاعر ماننے سے انکار کرتا ہے۔ کوئی اقبال کے سر پہ الزامات کا گٹھڑ رکھ دیتا ہے تو کوئی وکیلِ صفائی کا

فرض انجام دیتا ہے۔ اگر مقرر خدا نظر بد سے بچائے از قسم صدر شعبہ وغیرہ بلائے بے درماں ہے۔ تو جو اللہ دے اور بندہ لے ایسی قطعیت اور رعونت سے دوسرے اقبالیوں کی دھجیاں بکھیرے گا کہ سوائے "میں" کے کچھ سنائی نہ دے گا ——— میں لکھ چکا ہوں ——— میں نے لکھ دیا تھا۔ سب سے پہلے یہ نکتہ میں نے سمجھایا۔ میں کہتا ہوں۔"

عموماً منہ زور مقرر خالی الذہن ہوتے ہیں۔ جہاں کسی نے اقبال پر اعتراض کیا اور وہ لپکے ٹانگ پکڑنے ۔ سوائے اقبال کی شاعری کے ہر بات پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی لئے اچھے سے اچھا مقرر شاہیں بچہ معلوم ہوتا ہے بس آتے ہی ———

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا

اسی بہانے وہ نہ صرف لہو گرم رکھتے ہیں بلکہ خون بھی کھولاتے رہتے ہیں۔ غرض اقبال صدی تقریبات میں کبھی محمود کا اقبال جھلک دکھاتا ہے کبھی ایاز کا لیکن مومن کے اقبال کو کوئی پوچھتا تک نہیں ——— میں اقبال کو سمجھنے کے لئے اپنی مادرِ درس گاہ میں بیس سال بعد حاضر ہوا ہوں ——— درمیان میں بھی ایک بار آیا تھا مگر وہ آمد نہیں آورد تھی۔

"اقبال صدی"

(علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سیمینار میں پڑھا گیا)

۲۴ اپریل ۱۹۷۸ء

— ⁘ —

حرفِ آخر

پروفیسر عبدالمغنی

طرزِ پاشا

۱۹۶۹ء میں غالب صدی کے موقع پر ڈاکٹر اختر اورینوی، صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی، نے ایک کل ہند ادبی اجتماع کا اہتمام کیا۔ اس موقعے پر بہار سے باہر کے جن ادیبوں نے شرکت کی ان میں ایک احمد جمال پاشا صاحب تھے۔ وہ لکھنؤ سے تشریف لائے تھے جہاں وہ ادارہ "قومی آواز" سے وابستہ تھے۔ ان سے قبل عظیم آباد میں انکی شہرت ایک اچھے مزاح نگار کی حیثیت سے پہنچ چکی تھی۔ وہ ان کے تخلیقی جوش کا دور تھا اور ان کے مضامین بہ کثرت ملک کے موقر رسائل میں شایع ہوتے رہے اور دل چسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ان کی تازگیِ خیال اور عمدگیِ بیان دونوں کا اثر ان کے باذوق قارئین پر پڑتا تھا۔

اس کے ایک عرصہ بعد یکایک احمد جمال پاشا صاحب پٹنے میں بہاری بن کر نمودار ہوئے۔ معلوم ہوا کہ لکھنؤ سے سیوان (سارن) تک کا سفر ان کے لیے نہ صرف آسان بلکہ خوش گوار ثابت ہوا ہے، بہ قول جگر:

راہِ طلب آسان ہوئی ہے ٭ زلف و مژہ کے سایے سایے

اب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ پاشا صاحب ایک نئی شکل میں حیاتِ مستعار سے اٹھکھیلیاں کررہے ہیں۔ لکھنؤ کا صحافی اور طرح دار انشا پرداز اب ایک طرف تو ملکیتِ زمین کی زلفِ گرہ گیر سلجھا رہا ہے، دوسری طرف ایک مقامی کالج میں خطبۂ اردو ارشاد کررہا ہے اور تیسری طرف خدابخش کے دربار میں بیٹھ کر ایک نیا خدابخش بننے کی کوشش کررہا ہے۔ کچھ دوستوں کو یہ اندیشہ بھی ہوا کہ پاشا صاحب قاضی عبدالودود کی جانشینی کا سامان کررہے ہیں۔

بہر حال پاشا صاحب نے مزاح نگاری اور انشا پردازی سے اپنا ناطہ توڑا نہیں اور دیگر رشتوں کے ساتھ اس قدیم تعلق کی ذمے داریاں بھی ادا کرتے رہے، ان کے مضامین حسب معمول رسائل کی زینت بن کر خراجِ تحسین وصول کرتے رہے۔ اس کے علاوہ سیوان میں تو زلف وغیرہ کے سایے سایے پاشا صاحب جو کچھ بھی کرتے ہوں، پٹنے میں اپنی بہ کثرت آمدورفت سے انہوں نے گل فشانیِ گفتار کے ساتھ ساتھ علمی اور شخصی مزاح کے بھی گل بوٹے کھلانے شروع کیے۔ نتیجتہً عصرِ حاضر کے لاہور میں آئے دن ایک سے ایک لطایف وظرایف کی بارش ہونے لگی۔ چناں چہ جب جب پاشا صاحب یہاں آئے تو گنگا کی سطح پر کچھ تازہ بہ تازہ پھول پتیاں تیرتی نظر آئیں۔

اس طرح احمد جمال پاشا صاحب اپنے مضامین کی طرح ایک دل چسپ شخصیت بن گیے ہیں اور عظیم آباد کا شاید ہی کوئی دانش ور ہو جو ان کی صحبت سے لطف اندوز نہ ہوا ہو۔ وہ ایک ظریف کی طرح کسی کے دولت کدے یا غریب خانے پر وارد ہوتے ہیں اور اس کے بعد بعض وقت گھنٹوں مختلف سنجیدہ مسایل پر اپنے انداز خاص میں گفت وگو کرتے ہیں۔ یہ انداز ایسا سادہ و پُرکار ہوتا ہے کہ بسا اوقات لمحات کے گزرنے کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔ سادگی میں اس پرکاری کے بھی کچھ لطیفے بیان کیے جاتے ہیں، جن کا تعلق

خاص کران شوخیوں سے ہے جو پچھلے دنوں ہمارے حوصلہ مند مزاح نگار نے جناب کلیم الدین احمد مرحوم اور جناب قاضی عبدالودود مرحوم کی تنقیدی و تحقیقی بارگاہوں میں بھی روا رکھی ہیں۔ جہاں تک مشہور مزاح نگار شاعر جناب رضا نقوی واہی اور اب اسرار جامعی صاحب کے ساتھ پاشا صاحب کی گستاخیوں کا تعلق ہے' ان کے بارے میں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، یہ مزاح نگار با مزاح نگار کا معاملہ ہے اور اس کے اسرار و رموز بالکل عیاں ہیں۔

پاشا صاحب کی ترک تازیوں کا تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ان سطور کی تحریر کے وقت، وہ حجِ بیت اللہ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور بیگم کو بھی ساتھ لے گیے ہیں۔ خدا خانۂ خدا کو محفوظ رکھے اور پاشا خاندان کو بھی صحیح و سالم وطن آنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دیکھنا ہے کہ اب "اگر بہ مکہ رود" کی مثل صادق آتی ہے کہ نہیں۔ مزاجِ پاشا کی پختگی سے توقع یہی ہے کہ مزاجِ پاشا پر طوافِ کعبہ سے بھی کوئی اثر نہ پڑے گا' اِلّا یہ کہ شاید میری طرح خدا کا نور ان کے رخساروں پر بھی نمودار ہو جائے۔ اگر ایسا کوئی خوش گوار واقعہ ہوا تو مجھے یقین ہے کہ مزاح نگاری کی گہرائیاں کچھ اور بڑھ جائیں گی اور وہ انشا پردازی کی بلند تر چوٹیوں کی طرف پرواز کرتے نظر آئیں گے۔

حج سے پہلے کے احمد جمال پاشا کے مضامین کا یہ مجموعہ ان کی اب تک کی ترکانہ عشوہ طرازیوں کا ایک اور نمونہ ہے۔ وہ بڑی اچھی، شستہ و شائستہ اور رواں دواں نثر لکھتے ہیں، جس میں مزاح کی چاشنی فطری طور سے اور بغیر کسی تکلف کے گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ پاشا صاحب فقرہ بازی کا بہت کم استعمال کرتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار نہایت بے ساختگی کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ انشا پردازی کی یہ شان انہیں اپنے ہم عصر متعدد نثری مزاح نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ پاشا صاحب کے مضامین ہم بالعموم مزاحیوں کی بجائے

انشائیوں کی طرح پڑھتے ہیں، جن میں طنز و مزاح کے عناصر مقصود بالذا[illegible] صرف وسایلِ اظہار کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس اسلوبِ نگارش میں ظرافت ایک ایسی شگفتگی پیدا کرتی ہے جس میں تمسخر برائے نام ہوتا ہے۔

پاشا صاحب، کا طرزِ تحریر شوخی اور شایستگی کی ہم آہنگی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس کے مطالعے سے ذہن پر کسی مضحکہ خیزی کا بار نہیں پڑتا، صرف خوش طبعی کا لطیف احساس ہوتا ہے۔ ایسے طرزِ تحریر پر مشتمل مضامین آج کی مصروف و متمدن زندگی میں تنہائی کے بہت اچھے رفیق ہیں اور انہیں پڑھ کر ایک باذوق قاری تھوڑی دیر کے لیے خوش وقت ہو جاتا ہے، اسے زندگی کچھ زیادہ گوارا معلوم ہونے لگتی ہے اور تہذیبی قدروں سے اس کی وابستگی بڑھ جاتی ہے۔ یہ اثر جمالیات اور اخلاقیات کی اس ترکیب سے پیدا ہوتا ہے جو مضامین میں سموئی ہوئی ہے۔